Regd. L. No.7243

Phone: 890800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1979

اس پرچہ میں :-

میری زندگی کی آخری آرزو

(پرویز)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ		بدلِ اشتراک
۳ تین روپے	ٹیلیفون نمبر ۔ ـــــ ۸۸۰۸۰۰ **خط و کتابت** ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور	سالانہ پاکستان ۔ ۳۶/- روپے غیر ممالک ۔ ۳/۱/۲ پونڈ

شمارہ ۱۱	نومبر ۱۹۷۹ء	جلد ۳۲

فہرست

۱۔ اسلام میں اجتہاد کی اہمیت ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۲

۲۔ درسِ قرآن کے اعلانات ـــ ۳۰

۳۔ لمعات ـــ ۳۱

۴۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ـــ ۳۲

۵۔ "اُس رزق سے موت اچھی" ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۳۴

۶۔ قائدِ اعظمؒ اور قرآنِ مجید ـــ (مولانا غلام مرشد مرحوم) ـــ ۳۸

۷۔ قانونِ وراثت اور وصیت ـــ ۵۳

۸۔ قرآنک کالج و قرآنک ریسرچ سنٹر ـــ (شیخ سراج الحق) ـــ ۵۷
(اپنے انداز کی ایک منفرد درس گاہ)

۹۔ میری زندگی کی آخری آرزو ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۶۴

مدیر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر ۔ شیخ نیاز احمد ۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۔ اسپتال روڈ لاہور

باسمہ تعالےٰ

اسلام میں اجتہاد کی اہمیّت

پرویزؔ

پچھلے دنوں اسلام آباد میں جو شریعت کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں مسلم ممالک کے ممتاز علماء اور فقہا نے شرکت کی تھی۔ اس میں زیرِ بحث موضوعات تو متعدد تھے اور ان پر اہم مقالات بھی پڑھے گئے لیکن اس میں مرکزی خیال یہی تھا کہ اسلامی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں اجتہاد کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یعنی جو قوانینِ شریعت مروج چلے آرہے ہیں ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے یا وہ ابدی طور پر غیر متغیر رہیں گے۔ کانفرنس کی جو کارروائی اخبارات میں شائع ہوئی اس سے مترشح ہوا کہ اس اہم ترین اور بنیادی نکتہ کے متعلق شرکاء کانفرنس کے ذہن صاف نہیں تھے۔ طلوعِ اسلام اس موضوع پر عرصے سے لکھتا چلا آرہا ہے۔ کانفرنس کی روداد سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس بنیادی نکتہ سے متعلق طلوعِ اسلام میں شائع شدہ اہم مقالات کو پھر سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ ان کا آغاز پرویز صاحب کے ۱۹۶۳ء کے ایک خطاب سے کیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ طلوعِ اسلام میں شائع شدہ مقالات کی حیثیت اخباروں میں شائع شدہ خبروں کی سی نہیں ہوتی جو دوسرے ہی دن پرانی ہو جاتی ہیں۔ جو قرآن کریم کے ابدی حقائق پر مشتمل مقالات ہوتے ہیں جن کی اہمیت بدستور باقی رہتی ہے اور انہیں عندالضرورت وقتاً فوقتاً پیش کرنے سے اس اہمیت میں فرق نہیں آتا بلکہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔

قوموں کی زندگی میں عبوری دَور، بڑا ہی نازک، کشمکش انگیز، اضطراب خیز، شورش آمیز، محرومِ سکون و مجبورِ طمانیت اکثر و بیشتر یاس پرور اور صبر ربا ہوتا ہے۔ "عبوری دَور" سے مراد ہوتا ہے وہ زمانہ جس میں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے، اور جو کچھ ہونا چاہیئے، وہ ہنوز محسوس و مرتب شکل میں سامنے نہ آیا ہو۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کی تصویر جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر، ریلکے (RILKE) نے، ان حقیقت نگار الفاظ میں، مؤثر ترین انداز سے پیش کی ہے کہ

EACH TORPID TURN OF THE WORLD HAS SUCH
DISINHERITED CHILDREN,
TO WHOM, NO LONGER WHAT HAS BEEN, AND NOT
YET WHAT IS COMING, BELONG

انہی تاریخ کی گزرگاہوں پر ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں زمانے کی حرکت کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جاتی ہے۔ وہاں ہمیں

ایسے محروم الارث، بچے نظر آتے ہیں جن کی حرماں نصیبی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جو کچھ متواتر چلا آ رہا تھا، وہ ان سے چھن چکا ہوتا ہے، اور جس نے اس کی جگہ لینی تھی، وہ ہنوز ضمیرِ روزگار میں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور آب و تاب سے موزوں ہو کر سامنے نہیں آیا ہوتا ——— یہ، ساماں سوختہ اور متاع بردہ یتیم نسل، بیم و رجا کے ان دو راہوں میں عجیب کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔

ہماری موجودہ نسل

پاکستان کی موجودہ تعلیم یافتہ نسل، اسی کشمکش میں مبتلا ہے، اور بُری طرح مبتلا ہے۔ جن گھرانوں کا ماضی مذہبی روایات کے رشتوں سے بندھا ہوا ہے، ان میں اکثر و بیشتر اس قسم کی گفتگو سُننے میں آئے گی۔ اس نسل کا جواں سال نمائندہ کہے گا :-

ہم سرکش نہیں ہونا چاہتے۔ ہم تہذیب و اخلاق کی حدود شکنی پسند نہیں کرتے۔ ہم شرافت و نجابت کی انسانیت ساز زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن چچا جان! آپ سوچئے تو سہی کہ ہم سے مطالبہ کیا کیا جا رہا ہے؟ دنیا ہزاروں سال آگے بڑھ چکی ہے۔ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ زیست کے انداز بدل چکے ہیں۔ تمدن و معاشرت کی روشیں بدل چکی ہیں۔ زندگی کا ہر نظام ——— سیاسی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، ملی، بین الاقوامی ایک ایک کر کے، نئے قالبوں میں ڈھل چکا ہے۔ فکر کی فرسودہ راہیں پامال ہو چکی ہیں۔ سوچ کے طور طریق بدل چکے ہیں۔ غرضیکہ زندگی کے ہر نہج میں تبدیلی آ چکی ہے۔ لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کہ تم اسی انداز کی زندگی بسر کئے جاؤ جس انداز کی زندگی آج سے ہزار سال پہلے بسر کی جاتی تھی۔ تم اپنے اوپر انہی پابندیوں کو عائد کرو جو پابندیاں صدیوں پہلے کے انسانوں پر عائد کی گئی تھیں، تم سوچو تو انہی کے دماغ سے، سمجھو تو انہی کے دل سے، دیکھو تو انہی کی آنکھوں سے، سنو تو انہی کے کانوں سے۔ تم انہی کے متعین کردہ راستوں پر چلتے رہو، انہی کی وضع اور اختیار کردہ روشوں پر گامزن رہو۔ تم ہر نظریہ کو انہی کے پیمانوں سے ماپو، ہر عقیدہ کو انہی کی کسوٹی پر پرکھو جسے وہ غلط کہہ چکے ہیں، اسے غلط کہو، جسے انہوں نے صحیح قرار دیا ہے اسے صحیح سمجھو ——— یہ ہے جو ہم سے کہا جا رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم سے کہا یہ جا رہا ہے کہ اگرچہ تم بیس چوبیس سال کے جوان ہو چکے ہو لیکن تمہیں وہی جوتا پہننا پڑے گا جو تمہیں دس سال پہلے بنوا کر دیا تھا کیونکہ وہ جفت ساز اپنے زمانے کا بہترین کاریگر تھا۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس دس سال کے عرصہ میں ہمارے پاؤں کتنے ہی بڑھ گئے ہیں اور جوتا اتنے کا اتنا ہی ہے، اس لئے اب وہ فٹ نہیں بیٹھتا تو ہمیں کوسا جاتا ہے کہ تم بدتمیز ہو گئے ہو، گستاخ ہو گئے ہو۔ بڑوں کے سامنے بولتے ہو، بزرگوں کا ادب احترام نہیں کرتے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم اس کا کیا جواب دیں! ہمیں یہ علامہ اقبالؒ کے اس قسم کے شعر سناتے رہتے ہیں کہ ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

لیکن جب ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ ابا جان! زمانے کے انداز بدلے جا چکے ہیں، اس لئے ہمیں بھی اپنے آئین و ضوابط میں تبدیلیاں کرنی چاہئیں تاکہ، یہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کر سکیں تو ہمیں ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ زمانے کے حالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں اور اس کے تقاضے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائیں، یہ آئین و ضوابط ایسے ہی رہیں گے اور ان کی پابندی اسی طرح کرنی ہوگی۔ یہ شریعت کے احکام ہیں جن میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارے اسلاف کے فیصلے ہیں جو تم سے زیادہ سمجھدار تھے اور زمانے کے تقاضوں کو تم سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ اور پھر وہ بزرگ، تقویٰ اور پرہیزگاری میں اس مقام پر تھے کہ جس کی گرد کو بھی تمہارا زمانہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ہم ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی سوءِ ادبی ہے۔ یہ زمانہ ہی گستاخوں اور بے ادبوں کا آ گیا ہے۔

اور جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو آپ ہی فرمایئے، چچا جان! کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

گھروں کے اندر تو بات یہیں تک پہنچ پاتی ہے، لیکن جب یہ موضوع محراب و منبر سے چھڑتا ہے تو جس قدر شکن آلود پیشانیوں، قہر آمیز نگاہوں اور کف بردہاں سیلابوں کے ساتھ قوم کے نوجوانوں کو ہدفِ طعن و تشنیع اور نشانۂ سب و شتم بنایا جاتا ہے، اور جس جس قسم کے کفر و الحاد کے جگر پاش فتووں اور بے دینی و بے حیائی کے نفرت انگیز القابوں سے انہیں نوازا جاتا ہے، اس سے کون سا کان ناآشنا اور کونسا قلب نامانوس ہے؟ اور اس کے ردِ عمل میں، جب یہ نوجوان "کافی ہاؤسوں" میں اس سوال کو موضوعِ گفتگو بناتے ہیں، تو پھر کونسی پھبتی ہے جو قدامت پسندوں کے خلاف کسی نہیں جاتی، اور کونسا فقرہ ہے جو مذہب پرستوں پر چست نہیں کیا جاتا ہے۔

قوم کی کشتی، افراط و تفریط کے اسی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ دریا کی تلاطم خیزیاں، لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں اور ان کے تھپیڑوں سے کشتی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ناخدا جن کے ذمے اس کی حفاظت و سلامتی تھی، اسے بھنور میں چھوڑ کر، لبِ ساحل آرمیدہ ہیں۔ اور نہایت ذوق و شوق اور جذب و انہماک سے اس کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آیئے فرصت کے ان چند لمحات میں ہم دیکھیں کہ اس کش مکش کی حقیقی وجہ کیا ہے اور اس کشاکش کا حل کیا؟

پہلے ہم ان نوجوانوں کو لیتے ہیں کہ انہیں سنبھالنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر ہمارے یہ نوجوان اَن پڑھ قسم کے عامی ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ ایک بچہ بیس سال کا چھوڑ چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر سال کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اس کی شکل و شباہت، قد و قامت، وضع قطع، بود و ماند حتیٰ کہ اس کی ذہنیت و قابلیت اس کے امیال و عواطف، اس کے رجحانات و میلانات، غرضیکہ اس کی زندگی کے ہر عنصر میں تبدیلی آ جائیگی،

تعلیم یافتہ طبقہ

لیکن ایک حقیقت ایسی ہوگی جس پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ اس کی زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک، اٹل اور غیر متبدل رہے گی۔ یعنی یہ کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اس حقیقت کو نہ وہ بدل سکتا ہے، نہ زمانے کے تقاضے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا، ہمارے ان نوجوانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ زمانے کے بدلنے سے ہر شے میں تبدیلی آجانی چاہیئے۔ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں؟

لیکن چونکہ ہمارا یہ نوجوان طبقہ تعلیم یافتہ ہے اس لئے ہم ان سے، ان کی ذہنی سطح پر، ان کی زبان میں گفتگو کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ زمانے کے بدلنے والے تقاضے بجا اور درست، لیکن کیا زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی نہیں جن پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ اٹل اور محکم رہتی ہیں۔ کیا سائنس کے بنیادی قوانین، زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں؟ کیا جیومیٹری کی (PROPOSITIONS) آج بھی وہی نہیں جو آج سے تین ہزار سال پہلے تھیں، جب وہ دریافت ہوئی تھیں۔ کیا ریاضی اور الجبرا کے اساسی اصول، ازازل تا ابد، غیر متبدل نہیں رہتے۔ کیا حساب کا یہ ابتدائی سا گر کہ دو طاق عددوں (ODD NUMBERS) کی حاصل جمع ہمیشہ جفت (EVEN) ہوتی ہے، کسی حالت اور کسی زمانے میں بھی قابلِ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے! لہٰذا، یہ مطالبہ کہ زمانے کے حالات کے بدل جانے سے، ہر شے میں تبدیلی پیدا کر لینی چاہیئے، دنیائے علم و حقائق میں قابلِ تسلیم قرار نہیں پا سکتا۔ زمانے کے تقاضے لاکھ بدلیں، ناقابلِ تغیر حقیقتیں ہمیشہ ناقابلِ تغیر رہیں گی۔

قدامت پرست طبقہ

اور دوسری طرف ہم اپنے قدامت پرست بزرگوں کی خدمت میں عرض کریں گے کہ زندگی کی بقا کے لئے غذا کی ضرورت لاینفک ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں نہ نوعِ انسانی کی پوری تاریخ میں کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی فرد کی زندگی میں اس میں استثنار پایا گیا ہے۔ یہ زندگی کا غیر متبدل قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس پر بھی غور فرمائیے کہ یہ تفاصیل کہ آپ کس قسم کی غذا کھاتے ہیں، کس طریق سے کھاتے ہیں، کن کن اوقات میں کھاتے ہیں، ایسی ہیں جن میں ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں، تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ حتےٰ کہ ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور مختلف حالات میں ان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آپ کی بچپن کے زمانے کی غذا اور تھی، جوانی کی اور، اور بڑھاپے کی' ان دونوں سے مختلف۔ تندرستی کے زمانے میں غذا اور ہوتی ہے، بیماری کے دنوں میں اور۔ سردی میں اور قسم کی غذا کھانی پڑتی ہے۔ گرمی میں اور قسم کی۔ کلیہ غیر متبدل ہے لیکن اس کی عملی جزئیات میں، حالات کے بدلنے سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد آیئے ہم دیکھیں کہ ایک مسلمان کی زندگی میں کیا کیا چیزیں غیر متبدل ہوتی ہیں' اور کونسی ایسی، جن میں حالات کے مطابق تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ یہ سوال صرف اس لئے اہم نہیں کہ اس

سے ہماری قدیم اور جدید نسل میں ایک شدید کش مکش پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی اہمیت کی، اس کے علاوہ، ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ وجہ بنیادی ہے۔ اسے غور سے سنئے۔

اس مطالبہ میں کسی کو بھی اختلاف نہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں، لیکن اس کے باوجود، اس تیئیس سال[1] کے عرصہ میں، ان قوانین کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک عملی قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک یہ بنیادی سوال طے نہیں پا سکا کہ اسلامی قانون کہتے کسے ہیں۔

پاکستان میں بنیادی سوال

اس میں کون کون سے اجزا غیر متبدل ہیں اور کون کون سے ایسے جن میں، بہ تغیر حالات تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ منیر کمیٹی میں یہ سوال اٹھایا گیا تو علماء حضرات نے کہا کہ اسلام میں، مکمل ضابطہ قوانین پہلے سے موجود ہے جس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہے، نہ کسی تبدیلی کی اجازت۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس ضابطہ قوانین کو من و عن نافذ کر دے اور اگر کسی مسئلہ کی تعبیر و تشریح کی ضرورت پڑے تو علماء کی طرف رجوع کرے۔ دوسری طرف، ارباب بست و کشاد، جن کے سر پر ملکی قوانین کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، یہ محسوس کرتے تھے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر، علماء کے پیش کردہ ضابطہ قوانین کو من و عن نافذ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ان کی کمزوری تھی یا تقاضائے مصلحت کہ وہ جس حقیقت کو محسوس کرتے تھے اُسے کھلے کھلے الفاظ میں زبان پر نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ اس دوران میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں، ہر ایک نے اسی میں عافیت سمجھی کہ دستور میں تو یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک کے قوانین اسلامی ——— یعنی کتاب و سنت کے مطابق ——— ہوں گے لیکن اس سے آگے کسی نے ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ ہر ایک کی یہی کوشش رہی کہ یہ سوال کسی نہ کسی طرح ٹلتا چلا جائے۔ دوسری طرف علماء حضرات بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے ہاں تو ایک طرف، دنیائے اسلام میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا ضابطہ قوانین موجود نہیں جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرتے ہوں۔ نہ ہی فرقوں کی موجودگی میں ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ بھی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہ سوال عملاً سامنے آئے ہی نہیں۔ میرا تعلق، نہ ارباب حکومت سے ہے نہ اپنائے شریعت سے ——— اقبالؒ کے الفاظ میں، میں ؎

نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اور میرا مسلک یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آئے، قرآن کی بارگاہ سے پوچھوں کہ اس کا حل کیا ہے۔ قرآن کریم پر غور و تدبر سے، اس اہم ترین اور (بظاہر) مشکل ترین مسئلہ کا جو حل، میری بصیرت کے مطابق مجھے مل سکا ہے، اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت ہماری قوم اس (۴۰۰۵) ہی میں نہیں کہ کسی مسئلہ پر

---

[1] اب تیئیس سال کہیئے۔

سنجیدگی سے غور کر سکے؟ اس کے باوجود، میں اس سوال کو سامنے لا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید اس کے بعد ہمارا نصیبہ یاوری کرے اور قوم اس قسم کے بنیادی مسائلِ حیات پر غور و فکر کی ضرورت محسوس کرے، تو میری قرآنی فکر کے یہ نتائج اس کے کسی کام آسکیں۔ ورنہ اس وقت تو ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

(۰)

انسان کو جب اس دنیا میں بسایا گیا تو اس سے کہہ دیا گیا کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل تنہا عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تمہیں آسمانی راہ نمائی ملتی رہے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) جو اس راہنمائی کا اتباع کرے گا وہ بلا خوف و خطر، اور بے حزن و ملال منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اس راہ نمائی کے لئے پروگرام تو یہی تھا کہ

آسمانی راہ نمائی

زندگی کے بنیادی اور غیر متبدل اصول و اقدار کو وحی کی رو سے دیا جائے، اور اس بات کو ہر دور کے انسانوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی طریقِ کار خود وضع کریں۔ لیکن شروع شروع میں انسانی عقل و شعور خام اور اس کا تجربہ ناپختہ تھا، اس لئے ان اصولوں کی بیشتر جزئیات بھی خود وحی کی رو سے متعین کر دی جاتی تھیں۔ مثلاً جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وہ آنے والے سیلاب سے محفوظ رہنے کے لئے کشتی بنائیں، تو کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کی رُو سے بتایا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (۱۱/۳۷) "تم ہماری زیرِ نگرانی، ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔" اس طرح ایک رسول، غیر متبدل اصول و ضوابط اور اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، جزئیات و تفاصیل اپنی اُمت کو دے کر چلا جاتا۔ لیکن اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہوتا یہ کہ اس کے نام لیوا، مذہبی پیشوا، اپنی مفاد پرستیوں کے لئے، اس کی وحی میں اپنے خیالات کی آمیزش کر دیتے اور کہیں وہ دستِ بردِ زمانہ سے ویسے ہی تلف ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا اور ایک جدید ضابطۂ حیات بذریعہ وحی دے دیتا۔ اس میں غیر متبدل اصول تو وہی ہوتے جو سابقہ رسول کی وحی میں تھے لیکن جزئی احکام کا از سرِ نو جائزہ لیا جاتا۔ ان میں جو احکام ایسے ہوتے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جاتا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور عند الضرورت ان میں اضافہ بھی کر دیا جاتا۔ یہی وہ نظامِ وحی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔ (۲/۱۰۶) جو (سابقہ) حکم ہم منسوخ کر دیتے تھے اس کی جگہ اس سے بہتر حکم نازل کر دیتے تھے۔ اور جو احکام ایسے تھے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی لیکن انہیں فراموش کر دیا گیا تھا، ان کی دوبارہ ——

ط اور اب تو حالت اس سے کہیں زیادہ تاسف انگیز ہے۔

تجدید کر دی جاتی تھی ——— دوسرے مقام پر اسے "تبدیلِ احکام" کے پروگرام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۱۶/۱۰۱)۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ تاریخ انسانیت میں اس دور کا آغاز ہو گیا جس میں ذہنِ انسانی نے بلوغت تک پہنچ جانا تھا۔ اسکی علمی اور فکری صلاحیتوں میں پختگی آجانی تھی۔ اس کے تجربہ اور مشاہدہ کے میدان، افق تا افق پھیلتے چلے جانے تھے۔ تو اس وقت نوعِ انسان کو وحی کی رو سے آخری ضابطہ حیات عطا کیا گیا جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے۔ اس میں کچھ تو جزئی احکام تھے اور باقی زندگی سے متعلق وہ ابدی اصول و اقدار جو شروع سے غیر متبدل چلے آتے تھے اور جنہیں، قوانینِ کائنات کی طرح، ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا ——— انہی اصولوں کے متعلق کہا گیا کہ: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ..... (۴۲/۱۳)۔ تمہارے لئے بھی وہی الدین ——— ضابطہ حیات ——— تجویز کیا گیا ہے جو انبیائے سابقہ ——— مثلاً نوح، ابراہیم، موسےٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کی طرف وحی کیا گیا تھا۔ ان سے بھی ہم نے یہی کہا تھا ——— اور تمہیں بھی اسی کی تاکید کی جاتی ہے ——— کہ اس ضابطہ حیات میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ پیدا نہ کرنا ——— اس لئے کہ زندگی کے اساسی قوانین و اقدار میں اختلاف یا تفرقہ، نظامِ حیات کو درہم برہم کر دیتا ہے ..... یہی وہ الدین ——— غیر متبدل اصولِ حیات کا ضابطہ ——— تھا جس کا مھیمن (محفوظ ریکارڈ) قرآن کریم تھا (۵/۴۸) ان اصولوں کے علاوہ جو کچھ اقوامِ سابقہ کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا، وہ احکام شریعت تھے جو قابلِ تغیر و تبدل تھے۔ انہی کے متعلق کہا تھا کہ: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ (۵/۴۸)

اہلِ کتاب کا اعتراض

سابقہ مذاہب کے پیرو (اہلِ کتاب) چونکہ ان جزئی احکام کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھتے تھے، اس لئے وہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر یہ دین، جسے رسول اللہ ؐ پیش کرتے ہیں، وہی ہے جو انبیائے سابقہ کو دیا گیا تھا تو قرآن کے بعض احکام، اُن کے ہاں کے احکام سے مختلف کیوں ہیں؟ ان سے کہا گیا کہ اوّل تو تم نے اپنے رسول کے عطا کردہ ضابطہ ہدایت میں تحریف کر دی اور دوسرے یہ کہ ان جزئی احکام میں تبدیلی ضروری ہے۔ الدین، ناقابلِ تغیر اصولوں کا نام ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کا تنازعہ نہیں کیا جا سکتا ——— لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ۔ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ۔ (۲۲/۶۷) اس سے واضح ہے کہ الامر غیر متبدل اصولِ دین ہے، اور بدلتے رہنے والے احکام، مناسک و مناہج۔ انہی اصولوں کو، جو آخری مرتبہ قرآن میں دیئے گئے تھے، مکمل بھی کہا گیا اور غیر متبدل بھی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۶/۱۱۶) تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ انہیں قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ———

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔ (۱۵/۹) "تم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں" اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باب نبوت ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

قرآن کریم کا یہ حصہ دین کے اصولوں سے متعلق ہے۔ جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے جو اس میں مذکور ہیں، وہ بھی کم و بیش اصولی نوعیت کے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر حکم، خاص شرائط سے مشروط ہوتا ہے۔ اور اسے خاص حالات کے تحت نافذ کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا گیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہوں گے۔ (مثلاً) اس میں سرقہ (چوری) کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سرقہ کی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ اس نے اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے لیکن ان حالات و کیفیات کی وضاحت نہیں کی جنہیں اضطراری کہا جائے گا۔ اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔ اس نے ان کا تعین انسانوں پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ احوال و ظروف بدلتے رہتے ہیں اور نہ ہی شرائط غیر متبدل ہو سکتی ہیں۔

یہی الدّین ہے

یہ ہیں وہ اصول و اقدار اور احکام و ضوابط جو قرآن میں مذکور ہیں۔ انہی کے مجموعہ کا نام "الدّین" ہے۔ جن امور کے متعلق قرآن خاموش ہے، ظاہر ہے کہ ان کا تعلق دین سے نہیں۔ ان کے متعلق اس نے مسلمانوں سے تاکیداً کہہ دیا کہ ان کی بابت خواہ مخواہ کرید مت کرو۔ اگر ان کا تعلق دین سے ہوتا تو انہیں ہم خود ہی بتا دیتے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۔ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ ——

——— اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق زبانِ وحی خاموش رہی ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات مت کرو۔ ابھی نزولِ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ تمہارے سوالات کے جواب میں اگر وحی کی رو سے کچھ مزید احکام دے دیئے گئے تو وہ تمہیں ناگوار گزریں گے۔ سو تم مفت میں بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر پابندیاں عاید کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو۔ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۔ (۵/۱۰۲) تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عاید کر کے زندگی کو ناقابلِ برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش رہی ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ہم دانستہ خاموش رہے ہیں کہ ان امور کا تعلق دین سے ہے ہی نہیں ——— اس لئے ان کے سلسلہ میں کوئی پابندیاں نہیں لگائی گئیں۔ اس آیۂ جلیلہ کی تشریح حضور نبی اکرمؐ نے

نے ایک حدیث میں یوں فرمائی ہے کہ: إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا۔ وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔ "اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، ان کے متعلق کریدمت کرو۔ یاد رکھو! جن باتوں کے متعلق اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے، اس نے دانستہ ایسا کیا ہے، نسیان سے ایسا نہیں کیا (معاذ اللہ) بھول گیا ہے۔" (مشکوٰۃ: باب تمسک بکتاب وسنت)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

حاصلِ بحث

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد، انسانی راہ نمائی کی صورت یہ قرار پائی کہ:-

۱- جن امور کے متعلق قرآنِ کریم نے اصولی راہ نمائی دی ہے، جماعتِ مومنین، یعنی اسلامی مملکت، اُمت کے مشورہ سے، اپنے حالات کے مطابق، یہ خود طے کرے کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔

۲- جہاں تک احکامِ قرآنی کا تعلق ہے، اسلامی مملکت ان مواقع، حالات اور شرائط کا تعین کرے جن کے مطابق انہیں نافذ کیا جائیگا۔

۳- اسلامی مملکت اس امر کا بھی فیصلہ کرے کہ قوم کے موجودہ حالات کیا ہیں، اور قرآنی اصول و احکام کو کس طرح نافذ کیا جائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ، آخری منزل تک پہنچ جائے۔ یعنی نصب العین تو قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچنے کیلئے عملی پروگرام حالات کے تقاضوں کے مطابق، خود وضع کرے۔ کسی قوم کو اس کی آخری منزل تک لے جانے کے لئے، اصولِ تدریج

اصولِ تدریج

واہمال کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی، نزولِ وحی میں اس اصول کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ کی ایک روایت ہے کہ:-

> پہلے مفصّل سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے (یعنی ترغیب و ترہیب سے متعلق آیات)۔ پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے، تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ (مثلاً) اگر شراب نہ پینے کا حکم شروع ہی میں نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر ابتدا ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے بھی انکار کر دیتے۔ (بخاری باب تالیف القرآن)

(زنا سے غالباً مراد ہیں نکاح کے وہ طریقے جو عربوں کے ہاں رائج تھے، لیکن جنہیں قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا تھا)۔ امتناعِ شراب کے احکام میں جس تدریج کو ملحوظ رکھا گیا وہ اربابِ فکر و نظر کے لئے بڑی

بصیرت افروز ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی گھٹی میں شراب پڑ چکی ہو، جو نسلاً بعد نسلٍ اس کی عادی چلی آ رہی ہو۔ کیف و مستی جس کے خون کے ذرات میں حلول کر چکے ہوں، اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ یک لخت شراب چھوڑ دے۔ وہ اسے بتدریج ہی چھوڑ سکے گی۔ اسی حکمت کے پیشِ نظر قرآن کریم میں پہلے یہ آیا کہ خمر و میسرہ میں فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن ان کے نقصان، ان کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ ($\frac{2}{219}$)۔ پھر یہ کہا گیا کہ: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى ($\frac{4}{43}$)۔ تم نشہ کی حالت میں اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک نہ ہوا کرو، اور اس کے بعد، تیسری منزل میں، اس کی قطعی ممانعت کی گئی۔ ($\frac{5}{91}$) یہ ممانعت مدینہ میں آ کر ہوئی۔ اسی طرح قرآن کریم کے دیگر احکام پر نگاہ ڈالیئے۔ نظر آ جائے گا کہ اس نے اپنی اوّلین مخاطب قوم کی معاشرتی اور تمدنی سطح، اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو سامنے رکھ کر، ان احکام کو اس طرح بتدریج نازل کیا کہ وہ قوم تئیس سال کے عرصہ میں، اس پروگرام کے نقطۂ اوّلیں سے آہستہ آہستہ آخری منزل تک لے جائی گئی۔ جن سطح بین نگاہوں کے سامنے یہ بنیادی حقیقت نہیں، انہیں قرآنی احکام میں جا بجا تضاد نظر آئے گا۔ حالانکہ قرآن کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ: وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ($\frac{4}{82}$)۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم بہت سے اختلاف پاتے۔ تضادات کے اسی غلط تصور نے یہ عقیدہ وضع کرا دیا کہ قرآن کی بعض آیات، دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں۔

ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

حالانکہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر اٹل ہے اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ ناسخ و منسوخ کا تصور ہی غیر قرآنی ہے۔ اس کے احکام احوال و ظروف سے مشروط ہیں اور ان کا اطلاق موقع و محل کے مطابق ہوتا ہے۔ تدبّر فی القرآن سے مراد یہ ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے جو حالات اس وقت ہیں، ان میں قرآن کا کونسا حکم نافذ العمل ہونا چاہیئے اور وہ کون کونسی شرائط سے مشروط اور کس کس قسم کی قیود سے مقید۔ یہ شرائط و قیود، قرآن کریم کی اصولی راہ نمائی کی روشنی میں، حالات کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ یہ کام اسلامی مملکت کے کرنے کا ہے، نہ کہ افراد یا نجی اداروں کا۔

———— (٠) ————

قرآنی راہ نمائی کے مطابق سب سے پہلی مملکت، نبی اکرمؐ نے متشکل فرمائی۔ اس سلسلہ میں حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ($\frac{3}{158}$) معاملات میں، افرادِ اُمت (یعنی اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن کریم کے احکام اور اصول و اقدار سب منزّل من اللہ تھے۔ ان میں خود رسولؐ اللہ کے ذاتی خیالات و افکار کا بھی کوئی دخل نہیں تھا چہ جائیکہ اس سلسلہ میں دوسروں سے مشورہ لیا جاتا۔ جو کچھ مشاورت سے

پہلی اسلامی مملکت

طے کیا جانا مقصود تھا وہ یہی تھا کہ جو حالات اس وقت درپیش ہیں، ان کی روشنی میں، قرآنی اصول لیا

کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کس قسم کے جزئی ضوابط مرتب کئے جائیں، اور جو احکام قرآن میں آئے ہیں انہیں کونسی شرائط و حدود کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ ان امور کے فیصلے، باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے۔ اور (ظاہر ہے کہ) ان فیصلوں میں حالات کے مطابق حک و اضافہ اور تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ جو ہمیں کتبِ احادیث میں، ایک ہی مسئلہ کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ درحقیقت مختلف اوقات میں طے کردہ مختلف فیصلے ہیں۔ ہماری کتبِ روایات میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ان میں فیصلے تو دیئے گئے ہیں لیکن ان احوال و ظروف کی تفصیل و تصریح نہیں دی گئی جن کی روشنی میں وہ فیصلے دیئے گئے تھے۔ قانون دان حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کسی فیصلے کے صحیح مفہوم و منطوق تک پہنچنے کے لئے (CASE LAW) کا سامنے ہونا کتنا ضروری ہے۔ امت میں جو اس قدر فرقے پائے جاتے ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک گروہ نے رسول اللہ کے کسی ایک فیصلہ پر عمل شروع کر دیا اور دوسرے نے کسی دوسرے فیصلے پر۔ اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ سمجھ لیا کہ جس فیصلہ پر وہ عمل پیرا ہے، وہ ابدی قانونِ شریعت ہے، حالانکہ ان میں ابدی قانون کوئی بھی نہ تھا۔ یہ، مختلف احوال و کوائف کے ماتحت، صادر فرمودہ فیصلے تھے، جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک عملی مثال پر غور فرمایئے۔ قرآن کریم کی رو سے، زمین (یا وسائل پیداوار) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ امت کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے، اور مملکت اس کا انتظام کرتی ہے تاکہ وہ افرادِ معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں مختلف اوقات میں مختلف اراضیات مملکت کے قبضہ میں آئیں۔ آپؐ نے مفادِ عامہ کے پیشِ نظر، حالات کے تقاضے کے مطابق، ان کے متعلق مختلف انتظامات فرمائے۔ مثلاً خیبر فتح ہونے پر، زمین کو مملکت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس میں سے کچھ حصہ فوجیوں کو دے دیا اور بقیہ حصہ اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا اور پیداوار میں حکومت اور اصل باشندوں، دونوں کو شریک کر لیا۔ وادی القریٰ کی کل زمین آپؐ نے اصل باشندوں کے پاس رہنے دی۔ اس کے برعکس، بنو نضیر، جو جائیداد اور زمین چھوڑ گئے، آپ نے اسے مملکت کے زیرِ انتظام، مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد تمام زمینیں خلافت کے زیرِ اہتمام اصل باشندوں کے پاس رہنے دیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کا یہ اصول (کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، وہ مملکت کی تحویل میں رہے گی) تو اپنی جگہ پر اٹل اور غیر متبدل رہا، لیکن زمین کا انتظام، موقعہ اور محل کے لحاظ سے بدلا جاتا رہا۔ (آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کا کیا انتظام کیا)۔

اسی طرح جرائم کی سزا کے سلسلہ میں بھی آپ نے مجرموں کے احوال و کوائف اور ان کی ذہنی سطح اور نفسیاتی کیفیت کے پیشِ نظر مختلف اوقات میں مختلف فیصلے صادر فرمائے۔ مثلاً ایک شخص نے شراب پی اور اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ آپ نے اس کی حالت کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ

کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تمہارا جرم معاف کر دیا ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے ہمیشہ کے لئے شراب نوشی سے توبہ کرلی ——— یہ تھا اس میں اصلاح کا امکان جس کے پیشِ نظر حضورؐ نے اس پر تعزیر وارد نہیں کی۔ ایک واقعہ میں اصل مجرم کی جگہ غیر مجرم پکڑا گیا اور قانون کے مطابق حضورؐ نے اس کو سزا کا حکم بھی سنا دیا۔ لیکن بعد میں اصل مجرم نے آ کر کہا کہ مجرم وہ نہیں۔ میں ہوں۔ اس پر آپ نے دونوں کی سزا معاف فرما دی ——— پہلے کی اس لئے کہ وہ مجرم نہیں تھا، اور دوسرے کی یہ کہہ کر کہ اس نے ایک بے گناہ کو سزا سے بچانے کے لئے، اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ اس سے اس نے ایسی بلندیٔ کردار کا ثبوت دیا ہے کہ وہ معافی کا مستحق ہو گیا ہے۔ (نسائی) اس قسم کی اکثر مثالیں حضورؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں میں ملتی ہیں۔ ایسے فیصلے کرتے وقت، قوم کے عمومی جذبات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حطیم اس کے اندر شامل تھا۔ جب قریش نے اس کی تعمیرِ نو کی تو حطیم باہر نکال دیا۔ رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ حطیم کو کعبہ کے اندر شامل کر کے اسے ابراہیمیؑ خطوط کے مطابق تعمیر کر دیا جائے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا کہ:۔

> اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اساسِ ابراہیمیؑ پر اس کی تعمیر کرتا۔ اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر لیتا۔
>
> (مسلم باب نقض الکعبہ)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے تھے لیکن ان کی روشنی میں مختلف امور کے فیصلے کرتے وقت مصالحِ عمومی، افراد کے احوال و کوائف اور قوم کے امیال و عواطف کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح، مختلف اوقات میں طریقِ کار کا بھی اختلاف ہوتا تھا۔ مثلاً عدل، قرآن کا بنیادی اصول ہے، جس میں کسی صورت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن عدل کو بروئے کار لانے کا طریقہ مختلف اوقات میں مختلف ہو گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:۔

> شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا، وہی دین ہو گا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔
>
> (الطرق الحکمیہ)

لہٰذا، دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریقِ کار اختیار کیا جائے، اس کے لئے قرآن کی سند یا رسول اللہؐ سے ثبوت ضروری نہیں۔ طریقِ کار حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ شرط یہ ہے کہ وہ طریقِ کار قرآنی اقدار سے نہ ٹکرائے۔ خود حضورؐ نے مختلف اوقات میں مختلف طریقِ کار اختیار فرمائے تھے۔

———(٠)———

خلافتِ راشدہ

حضور نبی اکرمؐ نے اسلامی مملکت کو قائم فرمایا اور عملاً بتا دیا کہ اس میں ثبات و تغیر کا امتزاج کس طرح سے ہوگا۔ اس کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور مملکت کا نظام خلافتِ راشدہ کی تحویل میں آگیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زمانہ خلافت بہت مختصر تھا۔ ان کے بعد، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مملکت کی حدود بہت پھیل گئیں۔ نئی نئی قومیں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں۔ مختلف تہذیبوں کے ساتھ واسطہ پڑا۔ متنوع انداز کے تمدن سامنے آئے۔ کاروبارِ مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اس سے نئے مسائل ابھرے جن کا حل کرنا مملکت کا فریضہ تھا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ:۔

بے شک خدائے بزرگ و برتر، حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کیلئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

ان نئے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری تھا کہ نئے نئے فیصلے کئے جاتے۔ جو معاملات پہلی بار سامنے آئے اور ان کے متعلق جو فیصلے کئے گئے، انہیں مؤرخین نے "اوّلیاتِ عمرؓ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور ان کی فہرست طویل ہے۔ جن امور کے فیصلے عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ صدیقیؓ کے زمانے میں ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے، بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں بھی تغیر و تبدل کیا۔ یہی وہ گوشہ ہے جو ہمارے موضوعِ بحث کے لحاظ سے، قابلِ غور ہے۔ ایسے فیصلوں کی تعداد بھی کثیر ہے لیکن قلتِ وقت کی بنا پر، ان میں سے چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس وقت میرا مقصود تاریخی استقصاء نہیں۔ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلامی نظام میں ناقابلِ تغیر، قرآنِ کریم کے اصول و اقدار ہوتے ہیں، اور ان کی روشنی میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں، وہ حالات کے تغیر سے، بدلتے رہتے ہیں۔ نیز یہ کہ خود قرآنِ کریم کے احکام کا نفاذ بھی موقع اور محل کی رعایت سے، مناسب شرائط سے، _____ مشروط ہوتا ہے۔ وہ مثالیں جن کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:۔

حضرت عمرؓ کے فیصلے

(۱) قرآنِ کریم میں مسلمان مردوں کو، اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ صدیقیؓ میں اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے روک دیا کہ مجھے خطرہ ہے کہ یہ عورتیں امت میں فتنہ برپا کرنے کا موجب بن جائیں گی۔

(احکام القرآن۔ ابوبکر جصاص۔ نیز کتاب الآثار، امام محمد)

(۲)۔ اسی طرح، قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب کے طعام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کے شہروں سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ذبیحہ خانے ہٹا دیئے جائیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہم اپنے انتظام کی بنا پر ان سے مستغنی ہو گئے ہیں۔ (المدونہ۔ کتاب الذبائح)

(۳) ۔ قرآن کریم میں صدقات کے مال میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا ہے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ جو لوگ، اپنے سابقہ معاشرہ سے کٹ کر، اسلامی معاشرہ میں داخل ہوں اور اس سے انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، تو اس مد سے ان کی امداد کی جائے۔ رسول اللہ ؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت فاروقِ اعظمؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب ملک میں ایسی خوشحالی پیدا ہو چکی ہے کہ کسی کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس لئے مؤلفۃ القلوب کیلئے الگ امداد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (احکام القرآن ۔ جصاص)

(۴) رسول اللہ ؐ کے زمانے میں شرابی کو معمولی سی سزا دی جاتی تھی جس سے وہ اپنے کئے پر نادم ہو جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا[1] (سنن الکبریٰ)

(۵) قرآن کریم کی رو سے، سرقہ (چوری) کی سزا "قطع ید" ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں اس سزا کو موقوف کر دیا۔ عام حالات میں بھی اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر اضطراری حالت میں چوری کر لیتا تو اسے سزا نہ دی جاتی۔ ایک شخص کے غلاموں نے کسی کا اونٹ چرا کر کھا لیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ان کا مالک انہیں بھوکا رکھتا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مجبور ہو کر یہ اقدام کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چوروں کو تو معاف کر دیا اور اونٹ کے مالک کو، ان غلاموں کے مالک سے یہ کہہ کر تاوان دلایا کہ اس جرم کے مرتکب درحقیقت تم ہو جس نے ان غلاموں کو بھوکے رکھ کر انہیں چوری کرنے پر مجبور کر دیا۔ (آپ کا یہ فیصلہ، اسلامی نظامِ معیشت میں بڑی اصولی اہمیت رکھتا ہے)۔

(۶) رسول اللہ ؐ کا فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لیا نہیں جا سکتا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں، ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی فلاں شخص کی زمین سے گزرے۔ اور وہ اس کے لئے رضامند نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس کے راستے میں بالکل مزاحم نہ ہو۔ (الخراج ۔ یحییٰ)

(۷) اس سلسلہ میں عہدِ فاروقیؓ کا سب سے اہم فیصلہ عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے، زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں۔ اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔ رسول اللہ کے زمانے میں اراضیات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مسلمانوں کے قبضے میں آتے تھے جنہیں (مالِ غنیمت کے طور پر) بالعموم فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اگرچہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ان کے متعلق رسول اللہ ؐ نے بھی مختلف انتظامی طریق اختیار فرمائے تھے۔ جب عراق اور

---

[1] کوڑے کس قسم کے ہوتے تھے اس کے متعلق طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۵۳ء ملاحظہ فرمایئے۔

شام کے علاقے فتح ہوئے، تو ایک تو وہ رقبے بڑے وسیع و عریض تھے، اور دوسرے وہاں کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں۔ صحابہؓ کی اکثریت کی رائے تھی کہ انہیں، مالِ غنیمت کے طور پر فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ ان سے متفق نہیں تھے۔ یہ معاملہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اسے اعیانِ اُمت کی عام میٹنگ میں پیش کرنا پڑا۔ اس میں مختلف حضرات نے جو تقاریر کیں، تاریخ کے اوراق نے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اور وہ اس موضوع کے سمجھنے میں بڑی مفید ہیں۔ ان کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

عراق کی زمینیں

> یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہے۔ کیا آپ کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے، اور نسلاً بعد نسلٍ اُسی میں منتقل ہوتی رہے۔ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور حاجتمندوں کی کفالت کہاں سے ہوگی۔ مجھے اس کا بھی خدشہ ہے کہ لوگ پانی کی باریوں پر بھی فساد کرنے لگ جائیں گے۔
>
> (لہٰذا، میں ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھنا چاہتا ہوں۔ افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا)۔

پہلی میٹنگ میں فیصلہ نہ ہو سکا تو اسے دوسری میٹنگ میں زیرِ بحث لایا گیا۔ اس میں بھی بعض حضرات نے اپنے مؤقف کی تائید میں یہ دلیل پیش کی کہ رسول اللہؐ نے اراضیات کو فوجیوں میں تقسیم فرمایا تھا اس لئے ہمیں بھی ویسے ہی کرنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے بڑی مبسوط اور مدلّل تقریر فرمائی۔ جس میں، علاوہ دیگر دلائل و شواہد، قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا جس میں کہا گیا ہے کہ مالِ فئے میں مہاجرین اور انصار کا بھی حصہ ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (59/10) اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کا بھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس میں آنے والی نسلوں کا حصہ نہیں رہ سکتا اس لئے اسے مملکت کی تحویل ہی میں رہنا چاہیئے۔ یہ تقریر ایسی بصیرت افروز اور حقیقت کشا تھی کہ تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، میری کتاب۔ شاہکارِ رسالتؐ۔ باب معاشی نظام)۔

ان تاریخی شواہد کے پیش کرنے سے میرا مقصد اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ اگر حالات متقاضی ہوں تو اسلامی نظام کی رو سے، ایک اسلامی حکومت کے فیصلے، بعد میں آنے والی حکومت تبدیل بھی کر سکتی ہے اور ان میں حک و اضافہ بھی، بشرطیکہ یہ تبدیلیاں قرآن کے غیر متبدل اصولُ اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔

(۰)

خلافتِ راشدہ کے بعد، اسلامی حکومت کا یہ نقشہ باقی نہ رہا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کا وہ اصول جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے، اربابِ فکر و نظر کے سامنے نمایاں طور پر رہا۔ اس ضمن میں

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک

ہمارے سامنے، ملّتِ اسلامیہ کے متفقہ اعظم، امام ابوحنیفہؒ کی مثال متمیز طور پر آتی ہے۔ جہاں تک اسلامی قوانین و ضوابط پر تفقہ و تدبّر کا تعلق ہے، امام صاحبؒ کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکر و تدبّر کی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ دین کی اساس و بنیاد، قرآنِ کریم اور فکرِ انسانی پر ہے۔ جو کچھ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے، اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے مسائل کا حل، غور و تدبّر سے خود دریافت کرنا چاہیئے۔ اسے وہ اجتہاد یا تفقہ سے تعبیر کرتے تھے۔ جو لوگ آپ سے متفق نہیں تھے، وہ آپ کے اس مسلک کو قیاس قرار دے کر اس کی مذمت کرتے تھے۔ اس حد تک مذمت کہ وہ آپ سے کہتے تھے کہ: اوّل من قاس ابلیس۔ یعنی سب سے پہلے جس نے قیاس سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا۔ لہٰذا، تم ایسا نہ کرو۔ اس کے جواب میں امام صاحبؒ فرماتے تھے کہ

> میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قیاس نہیں۔ وہ تو قرآن کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ۔ (۶/۳۸) ہم نے کتاب میں کسی بات کو بھی چھوڑا نہیں۔ لہٰذا، جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ان لوگوں کے نزدیک قیاس ہے جنہیں خدا نے فہمِ قرآن کی نعمت سے نہیں نوازا۔ (کتاب المیزان)

امام صاحبؒ اپنی عقل و فکر کی روشنی میں، قرآنِ کریم سے استنباطِ مسائل کرتے تھے، اور سابقہ ادوار کے فیصلوں کو، نظائر (PRECEDENTS) سے تعبیر کرتے تھے جن سے، معاملات کا فیصلہ کرنے میں، استفادہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انہیں ہر زمانے میں من و عن نافذ کیا جائے۔ ان کے نزدیک، عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ کے فیصلوں کی بھی یہی حیثیت تھی۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں، بہت سی مثالیں درج کی ہیں جن سے امام صاحبؒ کا مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً یوسف بن اسباط سے ابو صالح الفراء نے یہ قول نقل کیا ہے کہ:

> ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ہم عصر ہوتے) تو آپؐ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۲۹۰)

دوسرے مقام پر ہے:۔

> محمود بن موسےٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحاق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے

اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کرتے۔ (ایضاً۔ ص۲۸۷)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے کہ

ابو عوانہ نے بیان کیا۔ کہ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچئے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً۔ ص۲۹)

امام صاحبؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ اور اسی کی خاطر میں نے یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے شک ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فیصلہ دیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہوگا۔ لیکن وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں، اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

علامہ اقبالؒ کا تبصرہ

امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک تھا جس پر علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

(خطبات۔ تشکیلِ جدید۔ چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظمؒ ابو حنیفہ نے، جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے

کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

> ان حالات کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات۔ صفحہ ۱۶۳-۱۶۴)

یہ تھا امام ابوحنیفہؒ کا مسلک جو عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں رائج مسلک کے عین مطابق تھا۔

اس کے خلاف تحریک

لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تحریک اُبھری جس کی رُو سے یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ جو کچھ پہلے زمانے میں ہو چکا ہے، اس میں سرِ مُو تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ وہ عین دین ہے اور اس میں تغیّر و تبدّل الحاد و بے دینی۔ جو کچھ سوچا جانا تھا، سوچا جا چکا۔ جو کچھ سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اب غور و فکر (جسے اجتہاد کہتے ہیں) کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شریعت کے جو احکام عہدِ رسالتمآبؐ میں نافذ ہو چکے تھے، وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ایک گروہ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ ان میں وہ احکام بھی شامل ہیں جو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں نافذ العمل تھے۔ چنانچہ ان احکام کے مجموعے مرتب کئے گئے اور وہ اُمت کے لئے دائماً، ناقابلِ تغیّر و تبدّل، ضابطۂ قوانین قرار پا گئے۔ اس تحریک کے پُرجوش محرک امام شافعیؒ نظر آتے ہیں۔ انہی نے یہ عقیدہ عام کیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ——— ایک وحی متلو اور دوسری وحی غیر متلو ——— یہ دونوں، خدا کی طرف سے، بوساطتِ حضرت جبریلؑ نازل ہوتی تھیں۔ وحی متلو قرآن کے اندر درج کر دی گئی اور وحی غیر متلو، احادیث کہلاتی۔ لہٰذا، رسول اللہؐ کو خدا کی طرف سے قرآن ہی نہیں دیا گیا۔ مثلہٗ معہٗ۔ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل، دوسری وحی بھی دی گئی جو احادیث میں منضبط ہے۔ اس عقیدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے، حالانکہ نہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر اُمت کو دیا تھا اور نہ ہی خلافتِ راشدہ میں ایسا ہوا تھا۔ احادیث کا پہلا مبسوط مجموعہ، جسے صحیح ترین مجموعہ کہا جاتا ہے، امام بخاریؒ نے تیسری صدی ہجری میں مرتب کیا تھا۔ اور وہ بھی بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، زبانی روایات کی بنا پر۔ احادیث کے تمام مجموعے اسی طرح مرتب ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے۔ یعنی اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو فیصلہ حدیث کی رو سے کیا جائے گا نہ کہ قرآن کی رو سے ——— اور پھر ایک قدم اور آگے بڑھے تو یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ حدیث، قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

حدیث کی اس پوزیشن کی رُو سے، جو کچھ احادیث کے مختلف مجموعوں میں آگیا (اور جسے صحیح قرار دے دیا گیا) وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار پا گیا ــــــ یہی عقیدہ آج تک چلا آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا پہلا ہدف، امام ابوحنیفہؒ کو قرار پانا تھا جنہوں نے یہ مسلک پیش کیا تھا کہ وہ فیصلے، غیر متبدل احکامِ شریعت نہیں تھے۔ چنانچہ ان حضرات کی طرف سے امام صاحبؒ کے خلاف وہ کچھ کہا گیا جسے دہراتے ہوئے ہماری روح پر کپکپی چھا جاتی ہے۔ امام مالکؒ بن انس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا فتنہ اس امت کے لئے (معاذ اللہ) ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں۔ عبدالرحمٰنؒ بن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے دجّال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھا۔ جب امام صاحبؒ کا انتقال ہوا تو امام اوزاعیؒ نے کہا کہ خدا کا شکر ہے۔ وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام میں (معاذ اللہ) ابوحنیفہؒ سے زیادہ بدبخت پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ابراہیمؒ حربی کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ابوحنیفہؒ کے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کے اس قسم کے فتاویٰ کی وجہ سے، امام صاحبؒ کے خلاف جذبۂ منافرت اس حد تک شدید ہو گیا کہ ابوعبیدؒ کہتے ہیں کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آگیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں، تو اسود نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ مسجد میں ابوحنیفہؒ کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ (یہ تمام تصریحات خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں موجود ہیں اور ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب، مقامِ حدیث میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے)۔

امام اعظمؒ کے مسلک کے متبعین نے کچھ وقت تک تو اس مخالفت کا مقابلہ کیا لیکن چونکہ مخالفین، لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ لوگ منکرینِ حدیث اور منکرینِ شانِ رسالت ہیں، اس لئے انہیں اس سیلاب بے پناہ کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ اور اس عقیدہ کو تسلیم کر لیا کہ جو احکام احادیث میں ہیں، وہ ناقابلِ تغیر ہیں، اور پھر اپنی فقہ کے فیصلوں کی تائید، احادیث سے شروع کر دی۔ یوں خود فقہ حنفی کے فیصلے غیر متبدل قرار پا گئے اور ان پر اجتہاد کے راستے بند ہونے شروع ہو گئے۔

اجتہاد کے دروازے بند

رفتہ رفتہ، یہ اس عقیدہ تک پہنچ گئے کہ (احادیث تو ایک طرف) جو کچھ ائمہ فقہ کہہ چکے ہیں وہ بھی قیامت تک ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک پیشوا اور مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا قول ہے کہ "ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو مأوّل ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مأوّل یا منسوخ ہے"۔ (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ خضری۔ صفحہ ۲۱۲) ظاہر ہے

کہ ان حالات میں اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد تو ایک طرف، یہ حضرات اب کسی مزید تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چند سال ادھر کا ذکر ہے، (جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ایک استفسار کے جواب میں کہا تھا کہ

> یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہِ اسلامی ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ .... لہٰذا، اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں، تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر اُمتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔
> (بحوالہ، ایشیا۔ ۱۳ اگست سنہ ۱۹۶۸ء)

حالانکہ ان کے سامنے، خود امامِ اعظمؒ کا یہ مسلک موجود ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتوے دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں، کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو۔ اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحبؒ فیصلے فرماتے ہم انہیں لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحبؒ نے ابویوسف سے فرمایا کہ یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کو ابویوسف سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطاکار ہوں یا مصیب۔ (خطیب بغدادی۔ جلد ۱۴۔ صفحہ ۳۵۲) یہ تھا امام صاحبؒ کا مسلک خود اپنی فقہ کے متعلق۔ یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں، اس میں امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ جس فقہ کو خود اس فقہ کے بانی، امام ابوحنیفہؒ ناقابلِ تغیر قرار نہیں دیتے تھے، ان کے نام لیواؤں نے اسے قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے لیا — اور اس طرح اُمت پر اجتہاد کے تمام دروازے مستقلاً بند ہو گئے۔ یہ کیفیت صدیوں سے مسلسل چلی آ رہی ہے۔

عقل و فکر مفلوج ہو گئے

نتیجہ اس کا یہ کہ عقل و فکر کی تمام صلاحیتیں، جنہیں قرآنِ کریم نے وجہ شرفِ انسانیت قرار دیا ہے، پہلے شل اور پھر رفتہ رفتہ مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ مسلمان اصولی طور پر دو فرقوں میں منقسم ہیں۔ ایک اہلِ حدیث اور دوسرے اہلِ فقہ۔ اہلِ حدیث کے نزدیک، علمِ دین سے مراد فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جو بات سامنے آئے، یہ بتا دیا جائے کہ اس کے بارے میں کتبِ روایات میں کیا آیا ہے۔ اور اہلِ فقہ کے

نزدیک یہ کہ اس کے متعلق ائمہ فقہ نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ جو شخص جتنے زیادہ حوالے پیش کر سکے وہ اتنا ہی بڑا عالم تصوّر کیا جائے گا۔ اسلامی زندگی سے مقصود یہ قرار پایا کہ قدم بقدم اسلاف کے راستے پر چلا جائے۔ کسی نے اس سے سرِ مو انحراف یا تجاوز کیا اور اربابِ شریعت کی بارگاہوں سے کفر و الحاد کے فتووں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اسلاف کی تقلید میں کس درجہ شدت اختیار کی گئی، اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ اموی دورِ حکومت میں، دمشق میں سب سے بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی اور اس کے بعد دیگر مساجد اس کے رخ پر بنائی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد، مسلمان انجینئروں نے حسابی قاعدہ کی رو سے دیکھا کہ جامع دمشق کا رخ کعبہ کی صحیح سمت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس مسجد میں صفوں کا رخ بدل دیا جائے اور آئندہ مساجد صحیح سمت کے مطابق تعمیر کی جائیں۔ مسئلہ اربابِ شریعت کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ جامع دمشق کا رخ جانبِ قبلہ نہیں تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے اسلاف نے جس قدر نمازیں پڑھیں وہ درست نہیں تھیں۔ ہم چند انجینئروں کی بات پر، اپنے اسلاف کی شان میں اس قدر سوءِ ادبی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان مساجد کا رخ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح وہی ہے جو اسلاف کرتے چلے آئے ہیں اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ کل خیر فی اتباع السلف۔ نیکی اور بھلائی بہ تمام و کمال اسلاف کے اتباع میں ہے۔ (بحوالہ شامی) چنانچہ مساجد کا رخ نہیں بدلا گیا ——— اور یہ مسلک اور عقیدہ اس قوم کا ہے جس کا خدا، کفار کے متعلق کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے حقائق پیش کئے جائیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان پر عقل و فکر کی روشنی میں غور کریں، اور دلائل و براہین کی رُو سے ان کے متعلق بحث و تمحیص کریں، یہ اتنا کہہ کر ان حقائق سے انکار کر دیتے ہیں کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۲) ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک راستے پر چلتے پایا اور ہم انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ اس لئے ہم کوئی ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتے جو ہمیں اسلاف کے راستے سے دوسری طرف لے جانے کا موجب بنے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے پایا ہے ——— اس پر قرآن کہتا ہے کہ: اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ۔ (۳۱/۲۱) خواہ شیطان انہیں جہنم کی دعوت ہی کیوں نہ دے، یہ اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔

تقلید کی شدّت

تقلید اور قرآن

اس کے جواب میں ہمارے اربابِ شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز

نہیں قرار پا سکتی۔ ایسا کہتے وقت وہ اس علّت پر غور نہیں کرتے جس کی بنا پر تقلیدِ اسلاف سے روکا گیا ہے، وہ علت یہ ہے کہ خدا جب مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس لئے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کی راہنمائی غیر متبدل ہونے کی وجہ سے ہر زمانے میں واجب الاتباع ہوتی ہے، اور اسلاف کا مسلک، خواہ ان کے زمانے میں صحیح بھی کیوں نہ ہو، ہر زمانے میں اتباع کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے ابدی پیروی کتاب اللہ کی ہوگی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کی روش کی۔ حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی اس باب میں قندیلِ ہدایت ہے، آپ نے فرمایا:۔

الناس اشبہ بزمانھم من اسلافھم۔ (جاحظ۔ البیان والتبیین)

لوگ، اپنے اسلاف کے مقابلہ میں، اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

دین میں اس قدر جمود و تقلید کی بنیادی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ہماری حکومتیں اسلامی نہ رہیں۔ اس سے زندگی

جمود کی دوسری وجہ

میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہوگئی۔ دنیاوی امور حکومت نے اپنے ذمے لے لئے اور شرعی امور (جن سے مراد شخصی قوانین تھے)... ارباب شریعت کے حیطۂ اقتدار میں چلے گئے۔ سلطنتیں اپنے دائرۂ اختیار میں، قوانین میں ردّ و بدل کرتی رہیں۔ لیکن اربابِ شریعت نے اسی میں عافیت دیکھی کہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ اسی کی پابندی کرتے رہیں۔ اس کے لئے عقیدہ یہ وضع کر لیا گیا کہ ہر آنے والا زمانہ، سابقہ زمانے کے مقابلے میں، زہد و تقویٰ ہی میں نہیں،

ماضی درخشندہ حال تاریک

علم و بصیرت میں بھی پست تر اور خراب تر ہوتا ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوریؒ سنایا کرتے تھے کہ اثنائے حج میں انہوں نے دیکھا کہ مکہ کا ایک نجدی نانبائی، پکار پکار کر کہا کرتا کہ آج کی روٹی دو پیسے میں۔ کل کی (باسی) روٹی ایک آنہ میں۔ انہوں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم آج کی تازہ روٹی دو پیسے میں بیچتے ہو اور کل کی باسی ایک آنہ میں۔ کہنے لگا کہ کل کی روٹی، رسول اللہؐ کے زمانہ سے ایک دن قریب تر ہے۔ اس لئے قیمت میں گراں تر۔ یہ ذہنیت اگر انفرادی جذبات کی حد تک رہتی تو پھر بھی اس میں چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس نے اصولِ دین کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کو اپنا ماضی روشن دکھائی دیا۔ حال تاریک، اور مستقبل تاریک تر۔

علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کی اس صورتِ حال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی بنیادی وجہ، مسلمانوں کی کسی مملکت کا بھی اسلامی نہ ہونا ہے۔ اگر کسی ایسی مملکت کا قیام عمل میں آجائے جس میں صحیح قرآنی نظام نافذ ہو، تو اسلام از سرِ نو زندہ ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک، اس اسلام کا تصور کیا

علامہ اقبالؒ کا تصورِ اسلام

تھا جسے وہ اس طرح زندہ کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انہوں نے اپنے خطبات "تشکیلِ جدید" کے چھٹے خطبہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کا عنوان ہے ــــ اسلامی قانون بحیثیت اصولِ ارتقاء ــــ اس میں انہوں نے کہا ہے:۔

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ــــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ــــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

قائدِ اعظمؒ

یہ تصور انہوں نے سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں پیش کیا اور اس کے بعد، سنہ ۱۹۳۰ء میں، الٰہ آباد کے خطبہ میں، انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد رکھ دی ــــــ قائدِ اعظمؒ نے جب اس مطالبہ کو اپنایا تو ان کے پیشِ نظر بھی اسلامی نظام کا ہی تصور تھا۔ میں نے قائدِ اعظمؒ کے ساتھ اپنے تعلقات کا کبھی چرچا نہیں کیا اس لئے کہ اس سے (بالخصوص ان کی وفات کے بعد) خود ستائی اور نمود خویش کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن، میں اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس موضوع پر ان سے میری اکثر گفتگو رہتی تھی ــ (بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان سے میرے تعلقات کی بنیاد ہی یہ تھی)۔ اسلامی نظام کا یہ تصور ان کے ذہن میں بھی بالکل صاف تھا اور اس کی طرف انہوں نے کئی بار اپنی تقاریر اور بیانات میں اشارہ بھی کیا تھا۔ اس سلسلہ میں، ان کا وہ بیان جو انہوں نے حیدر آباد (دکن) کے طلبا کے سوال کے جواب میں دیا تھا، ایسا واضح ہے کہ اس کی روشنی میں، اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی مملکت، جس کے لئے مطالبۂ پاکستان پیش کیا جا رہا ہے، کی امتیازی خصوصیت کیا ہے، فرمایا تھا:۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ مجید کے احکام

ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

علامہ اقبالؒ تو حصولِ پاکستان سے پہلے ہی عالمِ بالا کو تشریف لے گئے اور قائدِ اعظمؒ یوں کہیئے کہ ہنوز آئینِ پاکستان کی پہلی اینٹ بھی رکھنے نہ پائے تھے کہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد، یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری ان حضرات نے اپنے ہاتھ میں لے لی، جن کے سامنے اسلام کا وہی جامد تصور تھا جس کی جگہ حقیقی اسلام کے احیاء کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ . . . . . جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا ہے، جب منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے حضرات علمائے کرام پیش ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں نہ قانون سازی کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجالسِ قانون ساز کی حاجت۔ ہمارے پاس مکمل ضابطۂ قوانین بنا بنایا موجود ہے۔ حکومت کا کام فقط اتنا ہے کہ اس ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دے۔ اور اگر کسی باب میں انہیں کوئی دشواری پیش آئے تو اس کی بابت ہم سے پوچھ لے ——— دوسری طرف، اربابِ نظم و نسق کو اس کا احساس تھا کہ جس فقہی ضابطہ کو یہ حضرات یہاں نافذ کرانا چاہتے ہیں، وہ آج سے صدیوں پہلے کے حالات کے مطابق مرتب ہوا تھا۔ اور موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات

پاکستان میں کشمکش

کے پیشِ نظر وہ ممکن العمل نہیں رہا ——— یہ حضرات ان دشواریوں کو جانتے تھے لیکن ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کھل کر کہے کہ یہ ضابطہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم اپنے زمانے کے حالات کے مطابق خود قوانین وضع کریں گے ——— چنانچہ وہ بھی اس اصطلاح کی آڑ میں اس سوال کو ٹالتے رہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

یہ ہے وہ گرداب جس میں مملکت کی کشتی تئیس[1] سال سے پھنسی ہوئی ہے اور حساس قلوب کی ہزار تپش و خلش کے باوجود، ایک انچ بھی ساحلِ مراد کی طرف نہیں بڑھی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ سوال قانون سازی تک ہی محدود نہیں، قدامت پرست طبقہ کا تقاضا ہے کہ اسلاف کا اتباع زندگی کے ہر شعبے میں ضروری ہے ——— وضعِ قطع، تراش خراش، رہن سہن، نشست و برخاست، خورد و نوش، حتیٰ کہ فکر و خیال تک میں ان کی عائد کردہ حدود و قیود کی پابندی لازمی ہے ——— زمانے کا سورج، ہر نئی صبح، نئی دنیائیں اپنے جلو میں لاتا ہے، لیکن ان حضرات کا ارشاد ہے کہ کسی نئی بات کے متعلق ذہن میں خیال تک لانا بھی حرام ہے۔ ان کا یہ اعلان ہر خطبہ میں، ہر محراب و منبر سے، ہر کان میں مسلسل ڈالا جاتا ہے کہ

---

[1] اب تیئس سال سے۔

کلّ بدعۃ ضلالۃ۔ وکل ضلالۃ فی النّار

ہر نئی بات گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنّم میں لے جانے کا موجب۔

اور یہ ہے جدید و قدیم کی وہ کش مکش جس میں ہماری نئی نسل اس بری طرح سے گرفتار ہے۔ اس صورتِ حال سے کچھ ہم ہی دوچار نہیں ہوئے، دنیا کی ہر "مذہب پرست" قوم کو اس سے واسطہ پڑا ہے۔ لیکن ان کے ہاں اس کا علاج آسان تھا۔ انہوں نے مذہب کو گرجوں اور مندروں میں بند کیا اور زندگی کے معاملات میں پوری پوری آزادی حاصل کر لی لیکن اسلام کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ افراد کا ذاتی اور پرائیویٹ معاملہ نہیں۔ یہ وہ نظامِ حیات ہے جو اُمّت کی اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط اور اُن کی مملکت کا بنیادی آئین اور دستور ہے جو ابدالآباد تک قائم و دائم رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کا تقاضا ہے کہ اس میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں ڈر ہے کہ ——— یہاں بھی وہی حالت ہو جائے گی جو یورپ (یا دیگر مذہب پرست ممالک) میں ہوئی ہے۔ مذہب کو مساجد کے حجروں میں محبوس کر دیا جائے گا اور مملکت لادین ہو جائے گی ——— یعنی وہ وحی کے ابدی اصول و اقدار کو بھی چھوڑ دے گی ——— اور یہ ہماری ہی نہیں، نوعِ انسانی کی انتہائی بدقسمتی ہو گی۔

اس کش مکش کو آپ قدیم و جدید کی آویزش یا دین اور مذہب کی کشاکش کہہ لیجئے، لیکن اس باب میں خود مذہب پرست طبقہ (قدیم) کے اندر جو باہمی کش مکش ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہاں اسلام کا اس قسم کا نقشہ قائم کرنے کی تجویز یا کوشش کی جا رہی ہے کہ پرسنل لاز کی حد تک ہر فرقہ کو اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہو۔ لیکن پبلک لاز فقہ حنفی کے نافذ کئے جائیں کیونکہ اس فقہ کے پیروؤں کی یہاں اکثریت ہے۔ اس کے خلاف غیر حنفی فرقے (سنّی اور شیعہ دونوں) احتجاج کر رہے ہیں کیونکہ وہ فقہ حنفی کو کتاب و سنت کی صحیح تعبیر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ (اس کی مزید تشریح میں ذرا آگے چل کر پیش خدمت کروں گا)۔

یہ ہے وہ کش مکش جس میں یہ بدقسمت ملک اس وقت بُری طرح اُلجھا ہوا ہے اور جس کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جو اس ملک کو تباہی سے بچانے کا احساس اور درد اپنے سینے میں رکھتا ہے تو اس کے لئے فی الواقعہ ——— یہ گھڑی محشر کی ہے ——— اس طبقہ کو بہت بڑا جہاد کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے وہ کچھ سننا پڑے گا جو امام ابوحنیفہؒ نے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے سنا تھا اور جو خود مجھے تئیس (۲۳) سال سے سننا پڑ رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس طبقہ کے لئے یہ بشارت بھی ہے کہ اگر وہ اس خطۂ پاک میں حقیقی اسلام کے احیاء میں کامیاب ہو گئے تو پھر وہ دین، مملکتِ پاکستان میں ہی قائم نہیں ہو گا، اس کے عالم گیر ہو جانے کے راستے بھی ہموار ہو جائیں گے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ دینِ الحق، تمام ادیانِ عالم پر غالب آ سکتا ہے، تو اس میں الحق کی خصوصیت کا سمجھ

دین الحق کے معنی

لینا نہایت ضروری ہے۔ عربی زبان میں حق اسے کہتے ہیں جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل بھی ہو، اور اس کے ساتھ ہی، عند الضرورت متحرک بھی۔ عرب کس مقام پر حق کا لفظ بولتے تھے، اسے سمجھ لیا جائے تو دین الحق کی بنیادی خصوصیت سامنے آجاتی ہے۔ آج کل ہمارے دروازوں میں قبضے (HINGES) لگے ہوتے ہیں لیکن پہلے زمانے میں دروازے کی چول، ساکٹ (SOCKET) میں فٹ کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دروازہ اپنے مقام پر محکم بھی رہتا تھا اور ضرورت کے مطابق کھلتا اور بند بھی ہوتا تھا۔ اس طریقِ عمل کو وہ لوگ حق سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ امام راغب حق کے معنی مطابقت اور موافقت کرتے ہیں۔ دین وہی الحق ہو سکتا ہے جس کی کیفیت دروازے کی طرح ہو کہ حفاظت کے لئے وہ محکم طور پر بند بھی ہو سکے اور آنے جانے کے لئے کھل بھی سکے۔ اگر دروازہ مستقل طور پر بند رہے تو اسے دروازہ نہیں کہا جائے گا۔ اس کی حیثیت جامد دیوار کی سی ہو جائے گی۔ اور اگر وہ ہمیشہ کھلا ہی رہے۔ بند نہ ہو سکے تو اس میں اور کھلے میدان میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ...

دروازہ، جب تک، حالات کے مطابق، کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے، دین کہلاتا ہے۔ جب وہ ایک جگہ جامد ہو جاتا ہے، مذہب بن جاتا ہے۔ اور جب چوپٹ کھلا رہے تو سیکولر نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اسلام کو بہ حیثیت دین الحق زندہ کرنے کے متمنی ہیں، ان کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اسے دروازے کی حیثیت سے از سرِ نو قائم کریں۔ یعنی ایسا نظام قائم کریں جس میں :-

۱ - قرآنِ کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصول و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے خود مرتب کئے جائیں۔ قرآنی اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ احکام میں عند الضرورت تغیر و تبدل اور حک و اضافہ ہوتا رہے۔ ان قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں، ان احکام و ضوابط سے استفادہ کیا جائے جو اس سے پہلے مختلف زمانوں میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔

۲ - قرآنی احکام کو نافذ کرتے ہوئے، موقع و محل، احوال و کوائف، قوم اور افراد کی ذہنی اور نفسیاتی سطح اور اپنے زمانے کے عام تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالات کو سامنے رکھا جائے۔

۳ - قرآنِ کریم نے جس قرآنی معاشرہ کو منتہیٰ و مقصود قرار دیا ہے، اسے بطور نصب العین سامنے رکھا جائے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ وہاں سے بتدریج اس نصب العین کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا جائے۔

۴ - نبیٔ اکرمؐ کی جس سیرتِ طیبہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے اس کے نمایاں خط و خال قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اسے سیرت و کردار کا معیار قرار دیا جائے اور دیکھا جائے کہ قوم، انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے کس حد تک اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

۵ - نظامِ تعلیم ایسا مرتب کیا جائے جس سے ایک طرف، طلباء میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ

دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، انہیں معلوم ہو کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے، اور دوسری طرف، ان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو کہ قرآنی اصول و اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آرزو ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اور

۶۔ مملکت میں ایک ادارہ ایسا ہو (مثلاً سپریم کورٹ) جو اس بات پر نگاہ رکھے کہ مملکت کا کوئی قدم قرآنی اصول و اقدار کے خلاف نہ اٹھے۔

البتہ نظام کے قیام کی مخالفت، دنیا کے ہر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف سے ہو گی۔ یعنی ان ارباب سیاست کی طرف سے جو سیکولر حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ ان کے علاوہ قدامت پرست طبقے کی طرف سے اور نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے بھی اس مخالفت میں "خدا اور رسول" کے نام کو سب سے پہلے بطور حربہ استعمال کیا جائے گا تاکہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے میں آسانی رہے۔ لہٰذا، اس نظام کے قیام کے لئے، مومنانہ فراست کے ساتھ، قلندرانہ عزم اور بے باکانہ جرأت کی ضرورت ہو گی۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

یہ سوال کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے ——— وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ:۔

حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

جس قوم اور جس ملک میں یہ روحِ عمریؓ اُبھری، اسلامی نظام اسی میں قائم ہو سکے گا ..... باقی رہا مذہب، وہ خواہ عیسائیوں کا ہو یا یہودیوں کا، ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا ——— اس کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تدبّر کی فسوں سازیاں یا تقدس کی سحر کاریاں، اسے زمانے کے تھپیڑوں سے بچا نہیں سکتیں۔ دینِ حق ہوتا ہے اور مذہب باطل ——— وَاِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ——— باطل کو بہر حال میدان چھوڑنا ہوتا ہے۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ سُنَّةَ اللّٰهِ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ———

. . . . . جیسا کہ میں نے ذرا پہلے مجملاً بتایا ہے، تشکیل پاکستان کے فوری بعد یہاں مطالبہ شروع کر دیا گیا کہ چونکہ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اس لئے یہاں اسلامی نظام نافذ اور اسلامی قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ اس مطالبہ کو مجمل نہ رکھیئے۔ اس کی ذرا تشریح کیجئے۔ تو اس تشریح کی رُو سے کہا گیا کہ یہاں "کتاب و سنت"

کے مطابق قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ "کتاب و سنت" کی رو سے کوئی ایسا مجموعۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جس کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اس لئے اس اصول کے مطابق یہاں اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ مذہب پرست طبقہ کے پاس اس اعتراض کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں تھا ــــ کہ یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے، ملحد ہے، بے دین ہے حتیٰ کہ کافر ہے ــــ تئیس برس کی مسلسل مخالفت کے بعد، جماعتِ اسلامی (جو اس مخالفت میں سب سے آگے تھی) کے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب[1]، کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ پبلک لاز کے معاملہ میں:-

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔
(ایشیا۔ ۲۳ر اگست ۱۹۷۶ء)

لہٰذا، پرسنل لاز کی حد تک تو مختلف فرقوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں لیکن پبلک لاز کے لئے فقہ حنفی کو رائج کیا جائے گا جو یہاں کی اکثریت کی فقہ ہے۔ اہلِ حدیث فرقہ کی طرف سے اس تجویز کی پہلے ہی سخت مخالفت ہو چکی تھی۔ شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ کسی فرقے کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ جس فقہ کو ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے، اسے ہم سے، بطورِ قوانینِ شریعت، زبردستی منوایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ

اگر سوادِ اعظم کے راہ نماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے ہی سہی۔
(پمفلٹ ــــ آئینِ پاکستان اور مسلمہ اسلامی فرقے ــــ شائع کردہ سید محمد رضا رضوی، کنوینر، ادارۂ فلاحِ ملتِ پاکستان۔ حیدرآباد)

اگر یہاں یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور ملک خانہ جنگی کا اکھاڑہ بنا تو اس سے بچنے کی اس کے سوا کوئی شکل نظر نہیں آئے گی کہ یہاں سیکولر نظامِ حکومت رائج کیا جائے۔ اور اگر یہاں سیکولر نظام رائج کر دیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ مطالبہ ہوگا کہ اب پاکستان کو ہندوستان سے الگ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ دو قومی نظریہ یہاں پہلے سے ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہاں غیر مسلموں کو ایک الگ قوم قرار نہیں دیا گیا اور نظامِ حکومت یہاں سیکولر ہے۔ اس سے وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اور جب وہ بنیاد ہی ختم ہو چکی ہے تو اسے الگ مملکت

---

[1] یہ اب (۱۹۷۸ء میں) مرحوم ہو چکے ہیں۔ اور جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔

رکھ کر ہندوستان کے ساتھ جنگ کا مسلسل خطرہ برقرار رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہماری نئی نسل کے دل میں ——— جسے اسلام کی حقیقی تعلیم سے یکسر بیگانہ رکھا گیا ہے ——— یہ خیالات ابھریں گے اور اس کا جو نتیجہ ہوگا، اُسے زبان تک لانے کی کم از کم میں تو اپنے اندر ہمت نہیں پاتا ہوں۔ . . . مملکتِ پاکستان کو ان خانہ جنگیوں اور آخر الامر تباہی سے بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ مملکت کا قانونی ضابطہ اس طرح مرتب کیا جائے کہ قرآن مجید کو اساس اور بنیاد اور آخری معیار قرار دے کر، مختلف فرقوں کے فقہی ضوابط کو سامنے رکھ لیا جائے۔ ان میں سے جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اور موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرسکے، اُسے بحالہٖ رہنے دیا جائے۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے نئے احکام مرتب کر لئے جائیں۔ اس ضابطہ کو مملکت میں اس طرح نافذ کر دیا جائے کہ اس کا اطلاق تمام ملّتِ پاکستانیہ پر یکساں ہو۔ جہاں کوئی عملی دشواری پیش آئے، اس شق پر نظرِ ثانی کر لی جائے۔ اس طرح ثبات (قرآنی حدود) اور تغیر (جزئی احکام) کے امتزاج سے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ یہی وہ اجتہاد ہے جو دین کا تقاضا اور ملّت کی عملی ضرورت ہے۔ اس کے لئے شرطِ اوّل یہ ہے مختلف فرقے اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ احکامِ شریعت میں حسبِ ضرورت تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

محترم پرویز صاحب کا

درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
M9 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552 — 1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰)
بی ۲۵/ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چودھری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز (فون ۳۰۸۹۰) عقب اڈہ لاریاں (مائی دی جھگی)

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان۔ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۷۴۲۵۹)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز ہر دوسرے اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/ر بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

بقیہ: درسِ قرآن کریم صفحہ ۵۲ پر دیکھئے۔

لمعات

ہماری فقہ کی رو سے یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں وفات پا جائے اور اپنے پیچھے یتیم بچے چھوڑ جائے تو یہ بچے، اس شخص (یعنی اپنے دادا) کی وفات پر اس کے ترکہ سے کچھ نہیں پا سکتے۔ (اس جرم کی پاداش میں کہ وہ یتیم کیوں ہیں!)۔ یہ قانون صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا اور اس کے نتیجہ میں نہ معلوم کتنے یتیم، مظلوم، فاقوں مر گئے ہوں گے۔

جب ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین نافذ ہوئے تو ان میں یہ شق بھی شامل تھی کہ یتیم پوتے اپنے دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہو سکتے۔ یہ شق قرآن کریم کی منشاء کے مطابق تھی لیکن ہمارے علماء حضرات نے اس کے خلاف (بالکہ بالکلیہ عائلی قوانین کے خلاف) "جہاد" شروع کر دیا۔ لیکن ان کی مسلسل مخالفت کے باوجود یہ قانون ان کی زد سے محفوظ رہا۔

اب اخبارات میں یہ خبر چھپی ہے کہ پشاور ہائی کورٹ کے شریعت بنچ میں اس قانون کو چیلنج کیا گیا اور انہوں نے اسے خلافِ شریعت قرار دے کر منسوخ کر دیا ہے اور حکومت سے کہا ہے کہ وہ اس کی جگہ ایسا قانون نافذ کرے جس سے اس قسم کے یتیم بچے اپنے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیئے جائیں۔ بنچ نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ اس کے ساتھ وہ ایک قانون بھی نافذ کرے جس کی رو سے ایسے محروم الارث یتیم، ڈسٹرکٹ جج کو درخواست دے سکیں کہ وہ ان کے دادا (یا دادی) کو ترغیب دلائیں کہ وہ ان کے لئے اپنی وصیت میں کچھ گنجائش (PROVISION) رکھ دیں۔ اور اگر ایسے بچے بالکل بے سہارا رہ جائیں تو حکومت ان کی پرورش کا انتظام کرے۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ لاہور۔ بابت ۴ر اکتوبر ۱۹۷۹ء)

غالباً یہ پاکستان کی شریعت بنچوں میں سب سے پہلا فیصلہ ہے۔ ہم اس فیصلہ کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک ضروری وضاحت

اگلے دنوں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو نوبل پرائز ملنے کی خبر شائع ہوئی تو اس میں تاثر یہ دیا گیا کہ وہ پہلے پاکستانی "مسلمان" ہیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ربوہ کے روزنامہ الفضل نے اپنی ۱۷ر اکتوبر کی اشاعت میں اس خبر کو جلی سرخیوں کے ساتھ اس طرح شائع کیا ہے:۔

عالمی شہرت رکھنے والے پہلے مسلمان سائنسدان کو نوبل پرائز دیئے جانے کا اعلان۔ اس کے نیچے لکھا ہے: "ڈاکٹر سلام صاحب یہ خوشخبری سنتے ہی فوراً جماعت احمدیہ کی مسجد فضل لندن تشریف لے گئے اور شکرانے کے نفل ادا کئے ..... ڈاکٹر صاحب پہلے مسلمان سائنسدان اور پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے نوبل پرائز حاصل کرنے کا عظیم اعزاز حاصل کیا ہے"۔ جماعت احمدیہ (ربوہ) کے سربراہ نے ڈاکٹر صاحب کو جو مبارک باد کا تار بھیجا اس میں لکھا کہ "یہ بات انتہائی فخر کا موجب ہے کہ وہ پہلا مسلمان سائنسدان اور پاکستانی جس کو نوبل پرائز ملا وہ ایک احمدی ہے"۔

اسے نوٹ کر لینا چاہیئے کہ ڈاکٹر سلام صاحب احمدی ہیں۔ اور مملکتِ پاکستان نے احمدیوں کو مسلمانوں کے زمرہ سے خارج قرار دے رکھا ہے۔

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے

(۴) کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت اُمت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

طرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو۔ یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

(۰)

باسمہٖ تعالیٰ

اس رزق سے موت اچھی

(پرویز)

ایک مسلمان کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو۔ اس کے اخلاق بھی خراب ہوں۔ وہ احکامِ شریعت کی اطاعت بھی نہ کرتا ہو۔ وہ نماز روزے کا بھی پابند نہ ہو۔ وہ فاسق و فاجر ہو۔ حتیٰ کہ وہ زانی اور شرابی بھی کیوں نہ ہو۔ ایک بات ایسی ہے جس کا وہ نہایت سختی سے پابند ہوگا۔ وہ یہ کہ وہ سؤر (کے گوشت) کو حرام سمجھے گا۔ وہ اسے کبھی نہیں کھائے گا۔ اس پر ہزار سختی کی جائے یا کتنا ہی بڑا لالچ کیوں نہ دیا جائے، وہ اس کے قریب تک نہ جائے گا۔ سؤر کے گوشت کا کھانا تو ایک طرف، وہ اس کا نام تک سننا گوارا نہیں کرے گا۔ اس کے تصوّر سے اُسے جھرجھری آجائے گی۔ اگر اسے کہا جائے کہ تم نے فلاں بدمعاملگی کی ہے تو وہ (اپنی صفائی میں) بلا ساختہ کہے گا کہ میرے لئے تو ایک پیسہ بھی سؤر کے برابر ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح سؤر کے متعلق ہمارا ردِّ عمل یہ ہے، کیا ناجائز کمائی کے متعلق بھی ہمارا ردِّ عمل اس قسم کا ہے؟ بالکل نہیں۔ قطعاً نہیں۔ حالانکہ جس خدا نے سؤر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے اس نے ناجائز کمائی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ تو کیا یہ امر موجبِ حیرت نہیں کہ ایک حرام کے متعلق تو اس قدر شدید ردِّ عمل اور دوسرے حرام کے خلاف ردِّ عمل تو کجا، اس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ سؤر کا گوشت تو ایک طرف رہا۔ اگر کسی ہوٹل کے متعلق شبہ ہو جائے کہ اس میں کباب، سؤر کی چربی میں تلے جاتے ہیں، تو اس ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ لیکن وہی لوگ ساری ناجائز کمائی سے اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں اور انہیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم حرام کھا رہے ہیں۔ ناجائز کمائی میں بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں حکومت کا مروّجہ قانون حرام قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی کمائی کے متعلق یہ تو کہا جائے گا کہ ایسا کرنا جرم ہے۔ یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ ایسا کرنا "حرام" (یا گناہ) ہے ——— اور اگر معاشرہ میں جرائم عام ہو جائیں تو اس کمائی کے جرم ہونے کا احساس بھی مٹ جائے گا۔ اگر ناجائز کمائی کی بعض صورتیں ایسی ہوں، جنہیں مروّجہ قانونِ حکومت جرم قرار نہیں دیتا تو اس سے اجتناب برتنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔

ھ ہمیں معلوم ہے کہ بعض ممالک کے مسلمان اس معاملہ میں ایسے متشدد نہیں رہے۔ ہمیں ان سے سروکار نہیں۔ پاکستان میں ہنوز ویسی صورت پیدا نہیں ہوئی اور ہمارے اس وقت کے مخاطب یہی اہلِ پاکستان ہیں۔

لیکن جس خدا پر ایمان لانے سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس نے حرام اور حلال اور جائز و ناجائز کا معیار کچھ اور بنایا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ معیار کیا ہے۔

باطل کی کمائی

قرآن مجید کی دو اصطلاحیں بڑی بنیادی ہیں۔ یعنی حق اور باطل۔ قرآن کریم آمدنی کے جن ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے، وہ آمدنی حق کے مطابق اور حلال ہے۔ جن ذرائع کو وہ ناجائز ٹھہراتا ہے، وہ آمدنی باطل اور حرام ہے۔ حرام اور حلال کا یہ بنیادی معیار ہے۔

قرآن مجید سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۷-۱۸۳ میں روزوں کے احکام ہیں۔ روزہ کے معنے یہ ہیں کہ ایک مسلمان روزہ کی حالت میں خدا کے حکم کے مطابق ان چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام قرار دے لیتا ہے جنہیں خدا نے عام حالات میں حلال قرار دیا ہے۔ وہ خدا کے اس حکم کی اس شدت سے پابندی کرتا ہے کہ سخت سے سخت گرمی میں انتہائی پیاس کی حالت میں۔ کمرے کے اندر تنہا بیٹھے ہوتے جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں نہیں ٹپکاتا۔ لیکن روزوں کے احکام کے بالکل ملحق آیت (۲/۱۸۸) میں اسی خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ:-

وَلَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ۔ (۲/۱۸۸)

ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے نہ کھاؤ۔

"لیے روزہ" تو ایک طرف، وہ روزہ دار جو مرتا مر جائے گا لیکن پانی کا ایک گھونٹ نہیں پئے گا، باطل کی کمائی کے متعلق خدا کے اس حکم کی کچھ پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ روزہ کی حالت میں بھی ایسی کمائی کرنے میں مصروف رہے گا! ہمارے ہاں روزوں کے احکام کو آیت (۲/۱۸۷) تک محدود رکھا جاتا ہے۔ ان آیات میں آیت (۲/۱۸۸) کو شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن روزہ میں بھی تو مسلمانوں کو اس امر کی مشق کرائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کو چھوڑنے کا خدا حکم دے، وہ انہیں بلا تامل چھوڑ دے، خواہ وہ حلال ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن ہماری یہ پابندی صرف کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رہتی ہے۔ ناجائز کمائی کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ بالکل اسی طرح، جیسے سؤر کھانے کو تو حرام سمجھا جاتا ہے لیکن ناجائز کمائی کو حرام نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن کریم بنی اسرائیل (یہودیوں) کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بتاتا ہے کہ: أَكْلِهِمْ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ۔ (۴/۱۶۱) "وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھا جاتے تھے۔" اس کے آگے ہے ——— وَأَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ (۴/۱۶۱) "ان میں سے جو اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے، وہ کافر تھے اور ان کے لئے سخت عذاب کی وعید کی گئی تھی" ——— اس سے ظاہر ہے کہ ناجائز کمائی کرنا، کفر کے مرادف اور عذاب جہنم کا موجب ہے۔ ——— سوچئے کہ اس ناجائز کمائی کے خلاف اس سے زیادہ واضح اور سخت تہدید اور کیا ہو سکتی ہے!

باطل (ناجائز) کمائی کے بہت سے گوشے ہیں مثلاً۔ دغا۔ فریب۔ رشوت۔ چوری۔ خیانت۔ دھاندلی۔

گراں فروشی، چور بازاری - وغیرہ، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے گوشے کا ذکر خاص طور پر کیا ہے جس کی طرف عام طور پر ہماری نگاہ نہیں جاتی - اس نے کہا ہے:-

احبار و رہبان

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹/۳۴)

اے جماعتِ مومنین! (یاد رکھو) علماء اور مشائخ میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی طرف جانے والی راہ سے روکتے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

یعنی (وہ) روپیہ لے کر احکامِ شرعیہ اور اخبارِ الٰہیہ کو بدل ڈالتے ہیں - ادھر عوام الناس نے انہیں، جیسے پہلے گذرا، خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے - جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہی ان کے نزدیک حجت ہے - اس طرح علماء و مشائخ نذرانے وصول کرنے، ٹکے بٹورنے، اور اپنی سیادت و ریاست قائم رکھنے کے لئے عوام کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہِ حق سے روکتے رہتے ہیں - کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دینِ حق اختیار کر لیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے۔

(حاشیہ شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ - صفحہ ۲۴۸)

—————— (۰) ——————

خبیث اور طیّب

جائز اور ناجائز کمائی کے سلسلہ میں، قرآن مجید میں اور اصطلاحات بھی آئی ہیں - مثلاً —— طیب اور خبیث —— حق و باطل کی طرح یہ اصطلاحات بھی بڑی جامع ہیں لیکن موضوع زیرِ نظر کی رو سے، ان کا مفہوم بھی جائز اور ناجائز لیا جانا زیادہ مناسب ہے - اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا ایک مقصدِ جلیلہ یہ بتایا ہے کہ:-

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ - (۷/۱۵۷)

وہ لوگوں کے لئے طیّبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دے گا۔

قرآن کریم کے اس واضح ارشاد کے مطابق، جائز کمائی طیّب یعنی حلال ہے اور ناجائز کمائی خبیث یعنی حرام - یہی لفظ (حرام) لحمِ خنزیر (سؤر کے گوشت) کے متعلق آیا ہے - (۵/۳) لہٰذا ایک مسلمان کے لئے سؤر اور ناجائز کمائی میں ذرا بھی فرق نہیں، دونوں یکساں حرام ہیں - اسی لئے فرمایا کہ: لَا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ - (۵/۱۰۰) " چونکہ ناجائز طریق سے انسان چند دنوں میں لاکھوں پتی

ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص لپک کر اس کی طرف جاتا ہے۔ لیکن مسلمانو! تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ) جائز اور ناجائز کمائی کبھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی، اسی طرح جیسے حلال اور حرام ایک جیسے نہیں ہو سکتے"۔

قرآنِ مجید نے خبیث وطیب (جائز اور ناجائز) کی کئی مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ ہے کہ:-

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا۔ (۲/۴)

اور یتیموں کو ان کا مال اسباب ٹھیک ٹھیک دیا کرو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی طیب چیزوں کو رکھ لو اور ان کے بدلے اپنی خبیث چیزیں انہیں دیدو۔ نہ ہی ان کے مال اور اپنے مال کو ملا کر گڈمڈ کر دو۔ یاد رکھو! ایسا کرنا سخت بے انصافی کی بات اور وبالِ عظیم کا باعث ہے۔

"یتیم" سے بالعموم وہ بچے مراد ہوتے ہیں جن کا باپ فوت ہو جائے۔ یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اس کے بنیادی معنی ہر وہ شخص ہے جو معاشرہ میں تنہا، بے یار و مددگار رہ جائے۔ مندرجہ بالا حکم میں اس قسم کے تمام افراد شامل ہیں۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "ان احکام میں یتیموں کے حکم کو شاید اس لئے مقدم بیان فرمایا کہ یتیم بے سروسامانی اور مجبوری اور بے چارگی اور بے کسی کے باعث، رعایت اور حفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے"۔ (ایضاً صـ ۹۹) اس سے واضح ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں بے سروسامان۔ کمزور۔ مجبور۔ بے چارہ اور بے کس ہوں۔ ان کی بے کسی اور بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ حاصل کرنا، خبیث (حرام) ہے۔ آگے چل کر کہا کہ اس طرح حاصل کردہ مال کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ لوگ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں۔ (۱۰/۴) بادنٰی تعمق یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اکثر و بیشتر حالات میں ناجائز کمائی، دوسروں کی مجبوری، بے چارگی، بیکسی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر حاصل کی جاتی ہے۔ ایسی کمائی قطعاً حرام ہے۔

رشوت

آجکل حرام کمائی میں رشوت کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ اس کا چلن ایسا عام ہو گیا ہے کہ آپ نے اچھے اچھے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ کیا کیا جائے آجکل رشوت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ روزوں کے احکام کے تسلسل میں ایک آیت (۱۸۸/۲) کا ایک حصہ پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:-

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۸۸/۲)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ نہ ہی اسے بطور رشوت حکام تک

اس مقصد کے لئے پہنچاؤ کہ کسی دوسرے کے مال میں سے تمہیں وہ مل جائے جس کے متعلق
تم جانتے ہو کہ تم اس کے حق دار نہیں ہو۔

کس قدر صاف اور واضح ہے یہ حکمِ خداوندی۔ آج کون نہیں جانتا کہ رشوت حرام ہے لیکن اس کے باوجود جانتے بوجھتے اس کا چلن عام ہو رہا ہے۔ حیرت ہے کہ سُود کو حرام سمجھ کر اس سے مجتنب رہنے والے، رشوت کا مال کس طرح بلا غل و غش ہڑپ کرتے رہتے ہیں!۔

---(۰)---

کاروباری دُنیا

رشوت کا تعلق تو پھر بھی ایک مخصوص حلقہ سے ہے۔ یعنی ان لوگوں سے جنہیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا کچھ اختیار اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس راستے سے حرام کی کمائی سیلاب کی طرح اُمڈ کر آتی ہے وہ کاروبار کا میدان ہے۔ "کاروبار" میں تجارت، لین دین، خرید و فروخت بھی شامل ہے اور ملیں اور فیکٹریاں بھی جن میں محنت کشوں اور کارخانہ داروں کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ اس میدان میں ناجائز کمائی کے بے تحاشا امکانات کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے مختلف انداز سے احکامات دیئے ہیں۔ سب سے پہلے عام تجارت کو لیجئے۔ فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔ (۴/۲۹)

اے جماعتِ مومنین! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ معاشرتی زندگی میں روزمرہ کی اشیاءِ ضروریہ کی خرید و فروخت ناگزیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے جائز طریق یہ ہے کہ خریدار دکاندار کی منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور نہ ہو۔ بلکہ یہ گاہک اور دکاندار کی باہمی رضامندی سے ہو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یہ دوسروں کو قتل کر دینے کے مرادف ہو گا۔ خدا تمہیں ازراہ ترحم قتل و غارت گری سے بچانا چاہتا ہے۔

اس آیۂ جلیلہ میں خرید و فروخت کا ایک ایسا عظیم اصول بیان کیا گیا ہے جس سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور وہ ہے "باہمی رضامندی سے تجارت" اس سلسلہ میں جو کچھ آجکل ہو رہا ہے اس پر ایک نگاہ ڈالیئے۔ دکاندار (خواہ وہ تھوک فروش ہوں یا خوردہ فروش) ایک تنظیم قائم کر لیتے ہیں جس کی رُو سے وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ فلاں چیز اتنے داموں میں بیچی جائے گی۔ صاحب ضرورت، بازار (یا منڈی) میں پہنچتا ہے۔ دوکاندار اسے مطلوبہ چیز کی قیمت بتاتا ہے۔ خریدار دیکھتا ہے کہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ وہ کچھ کم کرنے کو کہتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ "میں تو اتنے ہی میں دوں گا۔ آپ کو کہیں اور سے سستی ملتی ہے تو وہاں سے لے لیجئے"۔ خریدار مختلف دکانوں سے دریافت کرتا ہے تو اُسے وہی قیمت بتائی جاتی ہے۔ فرمایئے کہ وہ،

اس کے بعد کیا کرے؟ اسے اس چیز کی ضرورت ہے اس لئے وہ اُسے انہی داموں خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دکاندار سے پوچھئے تو وہ نہایت اطمینان سے کہتے ہیں کہ صاحب! ہم کسی کی جیب نہیں کاٹتے۔ چوری نہیں کرتے۔ ڈاکہ نہیں ڈالتے۔ گاہک کو قیمت بتاتے ہیں اور اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اسے خریدے یا نہ خریدے۔ یہ قرآنِ مجید کے ارشاد کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اُس نے "تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" کو حلال قرار دیا ہے۔

اس جواب میں اس کے سوا کیا کہا جائے جو اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ (۲/۲۶) "اسی قرآن سے اکثر لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں اور اسی سے اکثر صحیح راستہ اختیار کرتے ہیں"۔ جس قسم کی تجارت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (اور جسے آجکل قطعاً ناجائز یا معیوب نہیں سمجھا جاتا) اسے قرآن کے حکم کے مطابق قرار دینا، ضلالت (خود فریبی) نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر یہ دکاندار (مثلاً) سبزی فروش ہے تو اس سے پوچھئے کہ جب تم قصاب سے گوشت خریدتے ہو اور وہ ایسا نرخ بتاتا ہے جسے تم نامناسب سمجھتے ہو، لیکن اس کے باوجود تم اس نرخ پر گوشت خریدنے پر مجبور ہوتے ہو، تو کیا تم اسے "باہمی رضامندی سے تجارت" قرار دیتے ہو! قصاب کی روش کو تو تم ظلم و زیادتی سمجھتے ہو اور اس کے خلاف واویلا مچاتے ہو لیکن اپنی اسی قسم کی روش کو بالکل جائز قرار دیتے ہو!

قرآن کریم نے اس قسم کی تجارت کو کاروبار نہیں بلکہ قتل و غارت گری قرار دیا ہے (وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ)۔ اور جیسا کہ معلوم ہے قتل، عدالتِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اسی لئے اگلی آیت میں ہے:۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ (۴/۳۰)

خدا نے بات واضح طور پر سمجھا دی ہے۔ اگر تم اس کے بعد بھی ایسا ہی کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دیدہ و دانستہ احکامِ خداوندی سے سرکشی برتتے اور ظلم اور زیادتی کرتے ہو۔ اس کی سزا جہنم ہے۔ عدالتِ خداوندی سے اس قسم کی سزا کا ملنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

چونکہ اس قسم کی تجارت میں، اشیائے ضروریہ کے تیار کرنے یا پیدا کرنے والے، مخوک فروش اور خورد و فروش سب شامل ہوتے ہیں، اس لئے تجارتِ عادلہ ایک خاص نظام کے تحت ہی عمل میں آسکتی ہے۔ یعنی ایسا انتظام جس کی رُو سے، ہر شے کا ہر اسٹیج پر منافع مقرر ہو اور اس کے بعد اس کا انتظام ہو کہ ہر ضرورت مند کو مقررہ قیمت پر مطلوبہ چیز مل جائے۔ اسے کہا جائے گا۔ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ یہی منافع حلال ہوگا۔

ربوٰ

قرآنِ کریم نے بیع کو حلال اور ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے۔ (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)

ربوٰ کی بحث تفصیل طلب ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ (میں اس کے متعلق تفصیل سے بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس وقت میں ربوٰ (سود) کی اس ابتدائی شکل کو لیتا ہوں جس میں ایک ضرورت مند، قرض دینے والے کو سود (یا بیاج) دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر، قرض خواہ جو کچھ وصول کرتا ہے، قرآن مجید اسے حرام قرار دیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس روش سے باز آجاؤ تو صرف اپنا اصل زر وصول کر سکتے ہو۔ اس سے لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) نہ تم پر ظلم و زیادتی ہوگی کہ تمہارا اصل تمہیں مل جائے گا۔ اور نہ ہی مقروض پر کوئی زیادتی کہ اُسے اپنی مجبوری کے تحت زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔

قرآنِ کریم کے اس اصول کے مطابق دیکھئے کہ اس نے جو بیع کو حلال کہا ہے اور ربوٰ کو حرام، تو اس میں بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ جو کچھ کسی سے اس کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر وصول کیا جائے وہ حرام ہے۔ اگر بیع میں بھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بیع، بیع نہیں رہتی، ربوٰ ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے تو مروجہ معاشیات میں پوری کی پوری تجارت، ربوٰ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور ایک تجارت پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج زندگی کا کونسا معاملہ ہے جس میں دوسرے کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جاتا؟

میزان

قرآنِ کریم نے میزان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بنیادی طور پر اس نے کہا ہے کہ کارگہِ کائنات، میزان کے سہارے چل رہا ہے۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ۔ (۵۵/۷) خدا نے ایسے قوانین وضع کر دیئے ہیں جن کی رُو سے آسمانی کُروں میں باہمی توازن قائم رہتا ہے۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ۔ (۵۵/۸-۹) اس لئے تم بھی اپنے معاشرہ میں عدل و انصاف کے ساتھ توازن قائم رکھو۔ اور کسی کے حقوق و فرائض میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔

انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے جو نظام قائم کیا جائے گا اس میں احکامِ خداوندی کے ساتھ میزان کو بھی منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ (۴۲/۱۷ ز ۵۷/۲۵)۔ اور قیامت میں اعمالِ انسان کے "تولنے" کے لئے بھی میزان کھڑی کی جائے گی۔ (۲۱/۴۷) اس میزان کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ: فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (۲۱/۴۷) "تاکہ کسی شخص پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو"۔ یہ ہے میزان کا بنیادی مقصد۔

میزان کے اس بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر، آپ کاروباری دنیا کی طرف آیئے۔ اس میں عام حکم تو یہ دیا گیا ہے کہ: اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۳ و ۱۷/۳۵)۔ خرید و فروخت کی دنیا میں تو اس حکم سے عام مراد یہی ہوگی کہ ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھنے سے

یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جو کچھ کسی سے لو، یہ دیکھو کہ اُسے اس کی قیمت کے مطابق چیز ملتی ہے۔ بظاہر ہے کہ ماپ اور تول صحیح رکھنا تو ہر دکاندار کا انفرادی عمل ہوگا لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ گاہک کو اس کی ادا کردہ رقم کے مطابق چیز مل رہی ہے یا نہیں، کسی نظام کے تابع ہوگا۔ یعنی اشیاء و صرف کی قیمتیں مقرر کرنا اس نظام کا فریضہ ہوگا۔ اسی میں یہ بات بھی شامل ہوگی کہ خریدار کو آمیزش کے بغیر مطلوبہ چیز ملے۔ یہ نہ ہو کہ قیمت تو دودھ کی ادا کرے اور ملے اُسے "دودھیا پانی" (MILKY WATER) یا کپڑے کے ہرگز پر لکھا ہوا تو ہو (PURE WOOL) اور ہو اس میں (NYLON) کا مکسچر۔ اس قسم کی تجارت بھی حرام ہوگی۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ جس قوم کے کاروبار میں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو جائیں، وہ بہت جلد تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی شہادت میں اس نے قوم شعیبؑ کی عبرت آموز داستان بیان کی ہے۔ حضرت شعیبؑ ان سے بار بار کہتے تھے کہ: فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا (۷/۸۵)۔ "تم ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو، اور جو کچھ کسی سے لو اس کے مطابق اُسے چیز دو۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ ایسا کرنا ملک میں فساد برپا کرنے کے مرادف ہوگا۔ جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ (نیز ۱۱/۸۴-۸۵، ۲۶/۱۸۱)۔ اس سے واضح ہے کہ خرید و فروخت کے غلط نظام کا نتیجہ پوری کی پوری قوم کی تباہی ہوتا ہے۔

(۰)

محنت کا معاوضہ

قرآن کریم کی رُو سے سب سے اہم سوال محنت کش کی محنت کے معاوضہ کا ہے۔ اگر اس کو محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیا جائے تو جو کچھ اس میں سے غصب کر لیا جائے، وہ حلال نہیں ہوگا، حرام ہو جائے گا۔ اس نے صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے کہ فرعون دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا تھا۔ اس لئے حضرت موسےٰؑ سے کہا گیا کہ اس کے مستبد اور ظالم نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کریں۔ لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی۔ (۲۰/۱۵) "تاکہ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے"۔ فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا ھَضْمًا (۲۰/۱۱۲) اور کسی کو اس کا خطرہ نہ رہے کہ اس کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوگی۔ اور اس کی محنت کے معاوضہ کو ہضم کر لیا جائے گا۔

نظامِ سرمایہ داری میں یہ ناممکن ہے کہ محنت کش (مستاجر) کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جا سکے۔ اس میں محنت کشوں کو اُجرت (WAGES) پر ملازم رکھا جاتا ہے، مستاجر (مزدور) اپنی اُجرت مقرر نہیں کرتا۔ اسے آجر (ملازم رکھنے والا) مقرر کرتا ہے۔ اس معاملہ کو یہ کہہ کر برحق قرار دے دیا جاتا ہے کہ مزدور اپنی رضامندی سے اُجرت منظور کرتا ہے، اس لئے اس پر کوئی ظلم اور

زیادتی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ وہی دلیل ہے جسے ہم تجارت کے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ "خریدار اپنی رضامندی سے قیمت ادا کرتا ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ خریدار ہو یا مزدور، دونوں اپنی مجبوری کی وجہ سے دوسرے کی بات مان لیتے ہیں۔ جس مزدور کے گھر میں کھانے کو ہو وہ کبھی آجر کی نامناسب شرائط پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس کی معاشی مجبوریاں ہوتی ہیں جو وہ ہر شرط پر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ "بھا دکین دگاڑیا ـــــ رات دیاں جھکیاں" "رات کو بھوکے سونے والے نرخ بگاڑ دیتے ہیں۔" قرآن کے معاشی نظام میں اُجرتوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب اور جہاں قرآنی نظام رائج ہو۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ مملکت ایسا طریق وضع کرے جس سے محنت کش کی محنت غصب نہ کی جا سکے۔ ہم تو آجر سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مستاجر (مزدور) کی محنت سے جو کچھ غصب کیا جائے وہ رزق حلال نہیں رہتا۔

کام چور

قرآنِ کریم جہاں آجر کو اس کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مستاجر کی محنت کو غصب نہ کرے، وہاں وہ مستاجر (مزدور) سے بھی کہتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ لینے کا حقدار ہے۔ اگر محنت کئے بغیر معاوضہ کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ کمائی بھی حلال نہیں ہوگی۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ (۵۳/۳۹) اس کا بنیادی اصول ہے۔ یعنی انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ "کام چور" کی کمائی، حلال کی کمائی نہیں کہلا سکتی۔

جو کچھ اوپر آجر اور مستاجر کے متعلق کہا گیا ہے اس کا اطلاق ملازمت پیشہ حضرات پر بھی یکساں ہوتا ہے۔ وہ بھی اُجرت ہی پر کام کرتے ہیں جسے تنخواہ کہا جاتا ہے۔

(۰)

تطفیف

بات چلی تھی ماپ تول کے پیمانوں سے۔ اس ضمن میں آجر اور مستاجر کے معاملہ کا ذکر آگیا۔ قرآنِ کریم میں ایک سورۃ ہے جس کا عنوان ہے۔ التَّطْفِيف ۔ تطفیف کے لغوی معنیٰ ہیں پیالہ کو پورا پورا نہ بھرنا۔ اس میں کچھ کمی کر دینا۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں "اونٹنی کے پاؤں اس طرح باندھ دینا کہ وہ پوری رفتار سے نہ چل سکے۔" ایسا کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے اسے قرآنِ کریم نے خود ہی واضح کر دیا۔ فرمایا۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۔ تطفیف کی ذہنیت اور روش اختیار کرنے والے تباہ ہو جاتے ہیں۔ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۔ یہ

وہ ہیں کہ جب دوسروں سے اپنے واجبات وغیرہ لیتے ہیں تو پورے پورے لیتے ہیں۔ ذرا نہیں چھوڑتے۔" وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔ (۸۳/۳) "لیکن جب دوسروں کے واجبات اور حقوق دیتے ہیں تو ڈنڈی مار جاتے ہیں"۔ اس آیت میں کالوھم اور وزنوھم کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دوسروں کو دیتے وقت ماپ اور تول میں کمی کر دیتے ہیں، اور یہ معنی بھی کہ چیزوں ہی کو نہیں۔ جب یہ خود انسانوں کو ماپتے اور تولتے ہیں تو ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق صلہ نہیں دیتے۔ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں کم از کم دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی نمود کر ہی نہ سکیں۔ وہ ان کے "پاؤں باندھ کر" رکھتے ہیں۔ یہ بھی دوسروں کی محنت اور صلاحیتوں کے استحصال (EXPLOITATION) کا ایک طریق ہے جو آجکل کے صنعتی دور کی عام روش ہے۔ اس طریق سے حاصل کردہ دولت بھی رزق حرام کے زمرہ میں شامل ہو گی۔

(۰)

خیانت

یہاں تک گفتگو ان معاملات کے بارے میں تھی جن میں دو فریق شامل ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان معاملات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک ہی شخص ملوث ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ: (لا) تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ (۸/۲۷) "جو امانتیں تمہارے سپرد کی جائیں ان میں خیانت مت کرو"۔ امانت صرف وہی نہیں جسے ایک شخص کسی دوسرے شخص کے پاس بغرض حفاظت رکھ دے۔ اس میں وہ تمام روپیہ یا مال اسباب وغیرہ شامل ہے جو حکومت، یا کوئی ادارہ یا فرم اپنے کسی ذمہ دار افسر کو کسی پراجیکٹ کی تکمیل کے لئے دیتی ہے۔ یا جو روپیہ پیسہ ویسے ہی اس کی تحویل میں رہتا ہے۔ جیسے خزانچی یا بینک کے افسر۔ اس روپیہ میں کسی قسم کی بددیانتی، خیانت ہے اور بدترین جرم۔ اس قسم کی کمائی یکسر حرام ہے۔

(۰)

حلال و طیّب

رزق حلال و حرام کے سلسلہ میں قرآن کریم بہت دور تک جاتا ہے۔ اس نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ: وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۵/۸۸) "جو حلال رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے کہ اسے طیب طریق سے کھاؤ اور اس طرح اس خدا کے حکم کی نگہداشت کرو جس پر تم ایمان لانے کا مدعی ہو"۔ "رزق حلال کو طیّب طور پر کھاؤ"۔ یہ نکتہ غور طلب ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ بکرا حلال جانور ہے،

لیکن اگر اسے خدا کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے تو اس کا گوشت حلال نہیں رہتا حرام ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو سب متفق ہیں اور ہم اس کی بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی کا بکرا چرا کر اسے صحیح طریق سے ذبح کر لیا جائے تو کیا وہ حلال رہے گا؟ قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ وہ حلال نہیں رہے گا۔ کیونکہ ناجائز طریق سے حاصل کئے جانے کی وجہ سے وہ طیّب نہیں رہا۔ لہٰذا جو چیزیں اپنی اصل کے اعتبار سے حلال ہیں اگر انہیں ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے تو وہ طیّب نہیں رہتیں، اس لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ حلال کے لئے طیّب ہونا شرط ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۔ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (۵/۴) اے رسولؐ! یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لئے کیا کچھ حلال قرار دیا ہے، ان سے کہو کہ اس نے طیّبات کو حلال قرار دیا ہے۔ یعنی ان حلال چیزوں کو جو ناجائز طریق سے حاصل کی گئی ہوں۔

"حلال اور طیّب" کی جامعیت کے طور پر قرآن مجید میں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (۲/۱۶۸) "اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال ہے اسے طیّب طریق سے کھاؤ۔ اسے غیر طیّب طریق سے کھانے سے تم شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے۔ یاد رکھو! شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ناجائز طریق سے حاصل کردہ دولت سے جو کچھ بھی تم خریدو گے، وہ اگر اپنی اصل کے اعتبار سے حلال بھی ہو تو بھی حرام ہو جائے گا۔ حلال وہی چیزیں ہوں گی جنہیں حلال کی کمائی سے حاصل کیا جائے۔ اسی کو قرآن مجید نے رزقِ کریم (۸/۴ ؛ ۲۲/۵۰) کہا ہے۔ یعنی "عزت کی روٹی" اس کی وضاحت کرتے ہوئے دوسری جگہ کہا

عزّت کی روٹی

کہ خبیث (ناجائز کمائی سے حاصل کردہ) چیزیں کھانے والے خود خبیث ہوتے ہیں اور طیّب چیزیں کھانے والے طیّب۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۲۴/۲۶)۔ یہی (طیّب لوگ) ہیں جو تباہی سے محفوظ رہتے ہیں، اور جنہیں عزت کی روٹی ملتی ہے۔

———(۰)———

تکاثر

ان تصریحات کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ لوگ ناجائز طریقے اسی لئے اختیار کرتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ دولت سمیٹنے کی دوڑ (RACE) میں ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں۔ اسے عربی زبان میں "تکاثر" کہتے ہیں جو قرآن کریم کی ایک سورۃ کا عنوان ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ: اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ (۱۰۲/۱-۲) دولت سمیٹنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس انسان کو زندگی کے صحیح مقاصد کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔

اور یہ دوڑ کہیں ختم نہیں ہوتی۔ یہ قبر تک چلی جاتی ہے۔ ضروریات کی ایک حد ہوتی ہے لیکن جب جذبہ محض دولت سمیٹنا ہو اور اس میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس، تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ یہ وہ پاگل پن ہے جس میں جائز اور ناجائز کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ ایسے لوگوں کا مقصدِ حیات جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ (۱۰۴/۲) رہ جاتا ہے۔ یعنی "دولت جمع کرتے چلے جانا اور پھر اُسے گنتے رہنا"۔ بس یہ ہوتی ہے ان کی زندگی! یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴/۳) ایسا انسان اس خیالِ خام میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گا۔ کَلَّا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ مال و دولت اُسے جہنّم رسید کر کے ریزہ ریزہ کر دے گا۔ (۱۰۴/۴) ناجائز کمائی سے جمع کردہ مال و دولت انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (۹۲/۱۱) جب تباہی اس کے سامنے آئے گی تو وہ کہے گا کہ میں اپنی دولت کو بڑی قوت کا باعث سمجھتا تھا لیکن هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۶۹/۲۹) قوت کا یہی زعمِ باطل مجھے لے ڈوبا اور کوئی یار و مددگار میرے کام نہ آیا (۶۹/۳۸)۔

انسان اکثر و بیشتر اولاد کی خاطر کمائی کے ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸)۔ یاد رکھو! اس طرح حاصل کردہ مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ اس سے بچو۔

(۰)

حلال اور حرام کمائی کے ضمن میں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ رزقِ حلال وہ ہے جو ان طریقوں سے حاصل کیا جائے جنہیں قرآنِ کریم جائز قرار دیتا ہے۔ اسے وہ حق کہہ کر پکارتا ہے۔ اور رزقِ حرام وہ ہے جو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے۔ اسے وہ باطل کہتا ہے۔ حق و باطل (حرام اور حلال) کے متعلق اس کا فیصلہ ہے کہ:-

وَیَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَیُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (۴۲/۲۴)

خدا کا قانونِ مکافات یہ ہے کہ حق باقی رہتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ باطل کے جواز میں تم کتنے ہی عذر پیش کرو، وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خدا تمہارے دل میں چھپے ہوئے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

لہٰذا، خدا پر ایمان رکھنے والے، ناجائز کمائی کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ ہمارے ہاں اس قسم کی بحثیں تو عام ہوتی ہیں کہ کونسا حلال ہے یا حرام۔ اے کاش! اس قسم کی بحثوں میں اُلجھنے والے مسلمانوں کو یہ بھی بتا دیتے کہ ناجائز کمائی سے حلال بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا حرام جس طرح سؤر کا گوشت حرام ہے۔ جس دن یہ حقیقت ہمارا جزوِ ایمان بن گئی، معاشرہ سے (CORRUPTION) اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے سوا اصلاحِ معاشرہ کی کوئی

صورت نہیں۔

(۰)

ایک کہانی

رزقِ حلال سے، معاشرہ کی خرابیوں ہی کا استیصال نہیں ہوتا۔ اس سے افراد کے کیریکٹر میں اس قدر پختگی اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے جس کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ہمیں بچپن میں ایک کہانی پڑھائی جایا کرتی تھی جو بڑی پُر معنی تھی۔ محمود غزنوی جب ہندوستان پر حملہ کے لئے آیا تو اس کی فوج میں ایک بیوہ کا نوجوان بیٹا بھی سپاہی تھا۔ جب اس کی فوج فاتح و منصور واپس گئی تو وہ بڑھیا اپنے بیٹے کی تلاش میں لشکر میں آئی۔ اس کے بیٹے کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ تمہارا بیٹا تو میدانِ جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ اس کی موت کس طرح واقعہ ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا۔ دشمن کا تیر اس کی پشت میں لگا اور وہ مر گیا۔ اس بڑھیا نے کہا کہ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا ہو لیکن اسے میں کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا تھا اور اس کی پشت میں تیر لگا تھا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سینے پر تیر کھایا ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ مائی! تم تو میدانِ جنگ میں تھی نہیں۔ تم یہ بات اس حتم و یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟ اس نے کہا کہ اس لئے کہ میں نے اس کے حلق میں حرام کے دودھ کا ایک قطرہ بھی ٹپکنے نہیں دیا تھا۔ جس بچے کی پرورش رزقِ حلال پر ہوئی ہو، ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔

بات بڑھتے بڑھتے سلطان تک پہنچی۔ اس نے تحقیق کرائی تو بڑھیا کی بات سچ نکلی۔ اس سپاہی نے اپنے سینے پر تیر کھا کر جان دی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے یہ غلط بیانی ہنسی مذاق کے طور پر کی تھی۔

یہ کہانی تاریخی اعتبار سے کیسی ہی ہو، حقیقت کے اعتبار سے بالکل سچی ہے۔ رزقِ حلال سے انسان کے اندر حق گوئی و بیباکی اور جرأت و بسالت کی وہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور جو قوم اس قسم کے افراد پر مشتمل ہو گی اسے دنیا میں کون شکست دے سکتا ہے؟ اسی حقیقت کے پیشِ نظر تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی!

حرام کی کمائی سے افراد اور قوم میں بلندیوں کی طرف جانے کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس فرد یا قوم کو حرام کی کمائی کا چسکا پڑ جائے، وہ محنت کرنے سے جی چراتی

ہے اور جب یہ عادت (یعنی محنت کے بغیر مال و دولت حاصل کرنے کی روش) پختہ ہو جائے تو محنت کرنے کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے باطل (ناجائز) کمائی کو اثم کہہ کر پکارا ہے۔ (۲/۱۸۸) اثم کے معنی ہیں ایسی روش جس سے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جائے اور انسان اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ کر پیچھے رہ جائے۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے مَیْسِرْ کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ (۲/۲۱۹)۔ ہمارے ہاں میسرہ کا عام ترجمہ جوا کیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ جوا بھی میسرہ میں شامل ہے لیکن اس لفظ کا اطلاق صرف جوا پر نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا مادہ یسر ہے اور یسار کے معنی بایاں ہاتھ ہیں۔ جس طرح ہم اپنے ہاں ہر آسان کام کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسی طرح ہر وہ کمائی جو محنت اور مشقت کے بغیر (ناجائز طریق سے) بآسانی حاصل ہو جائے وہ میسرہ میں شامل ہوگی۔ ایسی کمائی کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ: فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۲/۲۱۹) اس سے دولت تو ضرور اکٹھی ہو جاتی ہے لیکن انسان کے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جاتا ہے اور إِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ (۲/۲۱۹) اور قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جانے سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس فائدہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو اس طرح دولت حاصل ہونے سے ہوتا ہے۔

یہ ہے وجہ جو ناجائز کمائی سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس سے "پرواز میں کوتاہی" واقع ہو جاتی ہے۔ اور جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہو اس سے (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) موت ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے۔ چوری، فریب دہی، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، جیب تراشی، رشوت ستانی، خیانت، بددیانتی یا سشبا شب کروڑ پتی بن جانے کی ہوس۔ یہ سب اثم اور میسرہ (محنت سے جی چرانے) کے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار ہیں اور ان کا علاج رزقِ حلال ہے

گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام! (اقبالؒ)

جو قوم، قرآنِ کریم کے حرام قرار دادہ رزق کو حرام سمجھ لے اس کا نظامِ حیات قیامت تک محکم اور استوار رہے گا۔ والسلام

(۰)

قرآنی قوانین

پرویز صاحب کی تازہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم ایک مسلمان کی زندگی کے لئے کونسی حدود اور ضوابط مقرر کرتا ہے۔ اس میں آیات کے ساتھ مفہوم بھی دیا گیا ہے۔ قیمت مجلّد بیس ۲۰/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم

(ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور)

بیادِ مولانا غلام مرشد (علیہ الرحمۃ)

قائدِ اعظمؒ اور قرآنِ مجیدؐ

(مولانا غلام مرشد مرحوم کا مقالہ جو طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا)

○

پیرانہ سالی اور اس پر مختلف عوارض کے ہجوم نے پہلے ہی مضمحل کر رکھا تھا جو گزشتہ دنوں مسلسل بخار کی شدت نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ اور نقاہت اس قدر بڑھ گئی کہ تھوڑے سے وقت کے لئے بات چیت کرنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ جسمانی کوفت تو تھی ہی لیکن اس دوران میں دو ایک باتیں ایسی نظروں سے گزریں جنہوں نے انتہائی روحانی کرب پیدا کر دیا۔ سوچتا تھا کہ اگر تھوڑی سی سکت بھی پیدا ہو جائے تو میں کم از کم اپنی ایک شہادت کو قلمبند کر کے محفوظ کر جاؤں جس سے ثابت ہو سکے کہ محسنِ ملت قائدِ اعظمؒ کا قرآنِ حکیم کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا۔ اس احساس کی شدت، اس خیال سے اور بھی بڑھ گئی کہ کل قیامت کے دن کم از کم اس باز پرس سے بچ جاؤں کہ جب یہ اتنی بڑی شہادت تمہارے پاس موجود تھی تو تم اسے اپنے سینے میں مستور رکھ کر دنیا سے کیوں چلے آئے۔ لیکن میری نقاہت راستے میں بُری طرح حائل تھی۔ اس مشکل کا حل میرے واجب الاحترام دوست پروفیسر صاحب نے پیش کر دیا۔ انہوں نے مزاج پرسی کے لئے ٹیلی فون کیا تو میں نے ان سے اپنے اس کرب کا اظہار بھی کیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں اپنے ایک معاون کو آپ کی خدمت میں بھیجے دیتا ہوں۔ آپ جو کچھ لکھنا چاہیں انہیں املا کرا دیجئے۔ چنانچہ میں ان کے شکریئے کے ساتھ یہ الفاظ املا کرا رہا ہوں تاکہ یہ اس کے بعد طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ ہو جائیں۔

پہلی چیز جو میرے لئے اس روحانی کرب کا باعث ہوئی وہ جماعتِ اسلامی کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب کی پیش کردہ تثلیث تھی ـــــ یعنی یہ کہ ایک جداگانہ مملکت کا خیال اقبالؒ نے دیا۔ پاکستان کا نظریہ مودودی صاحب نے عطا فرمایا اور محمد علی جناحؒ نے اس کے مطابق ایک مملکت حاصل کر لی۔ اس قسم کی ایک تثلیث عیسائیوں نے بھی متشکل کی تھی ـــــ یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس ـــــ شروع میں تو یہ اقنوم ثلاثہ برابر کی حیثیت رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ باپ اور روح القدس بیٹے میں حلول کر گئے اور درعیسائیت کا ـــــ بلکہ یوں کہیے کہ ساری دنیا کا مدار علیہ حضرت مسیحؑ ہی رہ گئے۔ اس جدید تثلیث کے پیش کرنے والے جس بُری طرح سے پہلے تحریکِ پاکستان کے اور اب مملکتِ پاکستان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اس کی روشنی میں یوں نظر آتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس مثلث کے چھوٹے دونوں ضلعے ـــــ یعنی اقبالؒ اور جناحؒ ختم کر دیئے جائیں گے اور ان کے معزز مقتدیٰ ـــــ مودودی صاحب ـــــ خطِ مستقیم بن کر بانیٔ پاکستان

کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے آجائیں گے۔ تاریخ میں اس قسم کی تنسیخ و تحریف کوئی نیا واقعہ نہیں۔

دوسرا واقعہ جس نے میرے اس کرب کو شدید ترین درد میں بدل دیا، مودودی صاحب کا یہ ارشادِ گرامی تھا کہ قائدِ اعظمؒ کا پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا دعویٰ بھی محض فراڈ اور فریب تھا۔ مجھے الم انگیز کرب اس احساس سے تھا کہ یہ نابکار ایسا کچھ سننے کے لئے زندہ کیوں رہا؟ اس سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کیوں نہ ہوگیا قائدِ اعظمؒ کا قرآن مجید کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا اور وہ اس باب میں کس قدر مخلص تھے، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں اس میں ایک ذاتی واقعہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جیسے میں نے اپنی شہادت کہہ کر پکارا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے آخری ثلث کی بات ہے جب قائدِ اعظمؒ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین کے ساتھ ممدوٹ ولا (لاہور) میں قیام فرما تھے۔ ایک دن جب میں اپنے مکان ــــ جو مالہ نمبر A/151 میں بیٹھا ہوا تھا، قائدِ اعظمؒ کا ایک نمائندہ میرے پاس پہنچا اور کہا کہ قائدِ اعظمؒ نے مجھ خاکسار کو فوری طور پر یاد فرمایا ہے۔ میں فوراً چلنے کے لئے تیار ہوا، لیکن پھر خیال آیا کہ ــــ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم ــــ میں انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتا اور قائدِ اعظمؒ شاید میری زبان کو پوری طرح سمجھ نہ پائیں تو باہمی گفتگو کا نقشہ کیا ہوگا۔ اتفاق سے اس وقت میرے پاس مسٹر ایم مسعود کھدر (سابق آئی سی ایس، جو اس زمانے میں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر تھے) بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے ساتھ چلنے کے لئے کہا تاکہ وہ ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ ہم ممدوٹ ولا پہنچے تو قائدِ اعظمؒ ایک چھوٹے سے کمرے میں، جس کا دروازہ بڑے ہال کی طرف بھی کھلتا تھا، میرے منتظر بیٹھے تھے۔ سلام مسنون کے بعد انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک بڑے اہم دینی مقصد کے لئے بلایا ہے۔ جمعیت العلمائے ہند (دہلی) جس کے سرپرست مفتی کفایت اللہ مرحوم، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جیسے نیشنلسٹ علماء برسوں سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہیں، بہت سے علماء ہمارے ہم نوا بھی ہیں لیکن ان کی کوئی تنظیم نہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ کوشش جاری تھی کہ ان علماء پر مشتمل ایک متوازی جمعیت قائم کی جائے۔ اس کا مرکز کلکتہ تجویز پایا اور مختلف صوبوں میں اس کی شاخیں بھی قائم کر دی گئیں۔ اس کا افتتاحی اجلاس چند دنوں کے بعد کلکتہ میں ہونا قرار پایا۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں دعوت نامے بھی جاری کر دیئے اور مولانا راغب احسن (مرحوم) کے زیرِ سرکردگی جملہ انتظامات بھی مکمل کر لئے گئے۔ اس جمعیت کے نامزد صدر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس کا افتتاح کرنا تھا مگر سوءِ اتفاق سے وہ دیوبند میں علیل ہو گئے ہیں۔ جمعیت کے اجلاس میں چند روز باقی ہیں۔ وہ اس میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد قائدِ اعظمؒ نے اپنے مخصوص "جرنیلی" انداز میں فرمایا کہ تم جلد از جلد خطبۂ افتتاحیہ تیار کرو اور ۲۵/۲۴ اکتوبر تک کلکتہ پہنچ جاؤ۔ وہ ضابطہ کے اس قدر پابند تھے کہ انہوں نے کہا کہ تم "شعبۂ عمومی سیاست" میں میرے نائب کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرو اور اس ضروری دینی خدمت کو سرانجام دو۔ خاکسار نے ان کی اس سرفرازی پر شکریہ ادا کیا اور اس ضرورت کو اپنا اہم ترین فریضہ سمجھ کر رخصت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو۔ جس شخص کے نائب بن کر تم وہاں جا رہے ہو اس کی پوزیشن کے متعلق چند بنیادی نکتے ذہن میں رکھ کر وہاں جاؤ۔ ان کے سامنے میز پر قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ کا نسخہ رکھا تھا

اُسے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ میرا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اس کتابِ عظیم میں دنیا اور آخرت کی زندگیوں کے متعلق مکمل ضابطے اور آئین موجود ہیں۔ تمدنی، معاشی اور اخلاقی، اٹل اور دائمی قواعد موجود ہیں۔ عسکری تنظیم اور مملکت کے داخلی اور خارجی استحکام کے اٹل قوانین موجود ہیں۔ لوگوں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کے ابدی ضوابط موجود ہیں۔ لیکن یہ قواعد اور ضوابط بالعموم اصولی حیثیت سے دیئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ہوا جائے گا۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے قواعد و ضوابط مرتب اور نافذ کرے۔ مثال کے طور پر" انہوں نے کہا" قرآن کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ جرم کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس پر میں نے جرأت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے ذہن میں غالباً قرآن کریم کی وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰) اس پر انہوں نے فوراً قرآن مجید کھولا اور اس آیت کو دیکھ کر فرمایا کہ بے شک یہی آیت میرے ذہن میں تھی۔ اس کے بعد کہا کہ دیکھو یہ ایک اصولی حکم ہے اور ابدی۔ یہ دیکھنا اسلامی مملکت کا کام ہوگا کہ معاشرہ کے عام حالات کی روشنی میں کس جرم کی سزا کیا ہونی چاہیئے جو قرآن کے اس اصول کے مطابق ہو۔ سب سے پہلے رسول اللہ نے یہ ضمنی قوانین مرتب فرمائے۔

اس پر میں نے پھر سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضورؐ نے ایسا کچھ خود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کیا تھا جس کی رو سے کہا گیا تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) انہوں نے پھر قرآن کریم کو کھولا اور اس آیت کو نکال کر کہا کہ بات بالکل واضح ہے۔ اگر قرآن مجید کے اصولی احکام کے جزئی قوانین مرتب کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو مشاورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ کے بعد اُمت کو بھی اسی طرح تدوینِ قوانین کرنی ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے لئے بھی خدا کا حکم موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) انہوں نے پھر قرآن کریم سے یہ آیت نکالی اور کہا کہ خدا کی یہ ہدایت ہماری راہنمائی کے لئے کس قدر واضح ہے۔ اسلامی مملکت، جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں، کے آئین کی بنیاد یہی ہوگی۔

قائدِ اعظمؒ ان باتوں میں مصروف تھے اور کمرے کا دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ کیونکہ مسلم لیگ کے اراکین ضروری کارروائی کے لئے مضطرب تھے۔ اس پر میں نے اٹھنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے میں تمہیں کچھ نظائر معلوم ہوں تو مثال کے طور پر مجھے بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ سورۃ الانفال کی پہلی آیت میں جنگ میں حاصل شدہ مال کے متعلق ایک اصولی حکم ہے کہ وہ مال "اللہ اور رسولؐ" کا ہوگا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں مختلف جنگوں میں حاصل شدہ مالِ غنیمت کی تقسیم مختلف انداز سے ہوئی ـــــ جنگِ بدر کے خاتمہ پر ایک انداز سے، خیبر کی فتح کے بعد دوسرے انداز سے، جنگِ حنین اور ہوازن میں جو بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے وہ سارے کا سارا مال اُن مجاہدین میں تقسیم کر دیا جو ابھی کچھ عرصہ پہلے فتح مکہ کے وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ اس پر بعض گوشوں میں کچھ باتیں بھی ہونے لگیں۔ لیکن جب حضورؐ نے

اس کی مصلحت سمجھائی تو وہ بیک زبان پکار اٹھے کہ رضینا یا رسول اللہ ـــــ حضورؐ! ہم مطمئن ہیں۔

وہ ان تفصیلات کو بڑے جذب و انہماک سے سُن رہے تھے۔ وہ اس گفتگو کے لئے زیادہ وقت دینا چاہتے تھے لیکن مسلم لیگ کی کارروائی کے اصرار پر انہیں اسے مختصر کرنا پڑا۔ میں اٹھا، تو فرمایا کہ جاتے جاتے ایک اور بنیادی نکتہ بھی ذہن میں لے کر جاؤ۔ کہا کہ میری نظر میں قرآن مجید کے فیصلے کے مطابق دو بدترین اور ناقابلِ معافی جرم ہیں ـــــ ایک شرک اور دوسرا تفرقہ ـــــ تفرقہ خواہ مذہبی پیشواؤں کے نام پر، خواہ سیاسی راہنماؤں کے نام پر ہو، وطنیت کے نام پر ہو، رنگ نسل اور خون کے نام پر ہو، بہر حال جرمِ عظیم ہے۔ ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم (شرک) کی سزا اُخروی زندگی میں ملے گی۔ لیکن دوسرے جرم (تفرقہ) کی سزا اس دنیا میں ذلت و خواری، غلامی اور محکومی کی شکل میں ملے گی۔ اور آخرت میں اس سے بھی بدتر شکل میں۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ـــــ ایک مومن اور دوسرے کافر ـــــ اسی کا نام دو قومی نظریہ ہے۔ مومنین کے اندر کسی بنیاد پر تفرقہ ناقابلِ معافی جرم قرار پائے گا۔ اس نکتے کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا۔ جاؤ خدا حافظ۔

میں رخصت ہو کر آیا تو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ یہ شخص جسے عام طور پر صرف ایک بیرسٹر سمجھا جاتا ہے اس کی اسلام کے بنیادی اصولوں پر کتنی گہری نگاہ ہے۔ اور اس شخص کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے ذہن میں اسلامیت کی چھینٹ تک دکھائی نہیں دیتی، کتنا بڑا کذب و افترا ہے۔ میں نے حسب الارشاد خطبہ تیار کیا اور کلکتہ چلا گیا۔ ہم چار دن وہاں رہے لیکن کیفیت یہ تھی کہ قائداعظمؒ جہاں بھی تھے ہم سے رابطہ قائم کئے رہے اور تفصیلات معلوم کرتے رہے ـــــ آخری اجلاس ختم ہونے سے پہلے ان کی طرف سے تنظیم کے متعلق بھی ضروری ہدایات موصول ہو گئیں اور قراردادوں کے سلسلے میں بھی۔

ان قراردادوں میں یہ کہا گیا تھا کہ:-

(۱) تحریکِ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے جو قرآنِ مجید کا عطا فرمودہ غیر متبدل اصول ہے۔

(۲) اگر خدا نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی عطا فرمائی تو اس سرزمین میں حضور خاتم النبیینؐ کی طرز پر حکومت قائم ہو گی، جس کا نام خلافت علیٰ منہاجِ نبوت ہو گا۔ بالفاظِ دیگر اس حکومت کے ہر دائرے میں قرآنِ حکیم کی حکمرانی ہو گی۔

(۳) اکھنڈ بھارت کی اسکیم کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے گا اور اُسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ (اور ان کے علاوہ کچھ تنظیمی قراردادیں) اس مردِ مومن کی ہدایات کے مطابق مرتب اور منظور کی گئیں جسے ایک گوشے سے "کافرِ اعظم" کہہ کر پکارا جاتا تھا اور دوسرے گوشے سے "آواز بلند کی جاتی تھی کہ اس کی اسکیم کے مطابق جو مملکت قائم ہو گی اس میں حکومت ہندوؤں کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہو گی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد اس سرزمین کی سرحدوں کا تحفظ تھا۔ اور جن لوگوں کی آنکھوں پر حسد اور تعصب نے پٹی نہیں باندھ دی، انہیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ

ایسا کر تا خود قرآنِ مجید ہی کے ارشاد کی تعمیل میں تھا۔ وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ایک سال تک زندہ رہے —— زندہ کیا، یوں کہئیے کہ صرف سانس لیتے رہے اور جس مہلک مرض کا وہ شکار ہو گئے تھے اُسے ایک راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن اس ایک سال کے عرصہ میں انہوں نے اندرونِ ملک کی تنظیم اور بیرونی خطرات کی مدافعت کے سلسلے میں جو کچھ کیا اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر نحیف و نزار مریض شخص، محض قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر کیا کچھ کر سکتا ہے۔ میں مختلف مکتبوں اور دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بڑی بڑی نامور ہستیوں سے شرفِ تلمّذ اور تعارف حاصل رہا۔ میں نے سیاسی لیڈروں کو بھی دیکھا اور مذہبی رہنماؤں کو بھی۔ لیکن مجھے پوری زندگی میں قائدِ اعظمؒ سے بڑھ کر کوئی شخصیت متاثر نہ کر سکی۔ میں نے ہر ایک کو اُن سے کمتر پایا —— بلندیٔ کردار کے اعتبار سے بھی اور بصیرتِ قرآنی کے نہج سے بھی۔ اس قسم کے انسان صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان کے خلاف آج ہذیان بک رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ چاند پر تھوکا، خود اپنے منہ پر آیا کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تو کجا، سب مل کر بھی اس بطلِ جلیل کے غبارِ راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ اُسے اپنے سحابِ کرم کے سائے میں رکھے۔

والسلام

خاکسار۔ غلام مرشد (سابق خطیب
بادشاہی مسجد لاہور ۲۷-۵-۱۹۷۵ء)

۲۶/۶

بقیہ: درسِ قرآنِ کریم (صفحہ ۳۰ سے آگے)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔ لیہ

پنج کسّی میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام (تحصیل کبیروالا ضلع ملتان) بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام

خالص ہلدی مرچ مصالحے
حاصل کرنے کے لئے
اللہ والے
ریلوے روڈ گجرات
سے رجوع فرمائیے

قانونِ وراثت اور وصیّت

آپ کسی دن کسی دیوانی کچہری کے احاطے میں جا نکلئے (خدا کرے کہ آپ کو کبھی وہاں مجبوراً جانا نہ پڑے) وہاں آپ کو انسانوں کا اس قدر ہجوم نظر آئے گا جس کی مثال کسی میلے ہی میں مل سکے گی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میلے میں لوگ اپنی اپنی مرضی کے مطابق چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے دکھائی دیں گے لیکن کچہری کے احاطہ میں عجیب نفسا نفسی کا عالم نظر آئے گا۔ ہر شخص بدحواس، پریشان خاطر، پاگلوں کی طرح ادھر ادھر مارے مارے پھرتا۔ آپ ان سے پوچھیئے۔ کوئی بتائے گا کہ اسے پانچ سال ان ہی عدالتوں کا چکر لگاتے گزر گئے ہیں۔ کوئی دس سال بتائے گا۔ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ۔ ان میں زیادہ تر دیہات کے رہنے والے ہوں گے جن کی عمر کا بیشتر حصہ عدالتوں کی طرف آنے والے راستوں اور ان کی بھول بھلیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ مدعی ایک ہے تو اس کے گواہ اور حمایتی بھیڑ کی بھیڑ۔ یہی کیفیت مدعا علیہ کی ہے۔ آپ اعداد و شمار جمع کریں تو معلوم ہو کہ گاؤں کی آدھی آبادی سال بھر انہی چکروں میں رہتی ہے ــــــ وقت کا زیاں ــــــ پیسے کا ضیاع ــــــ توانائی کا صرف ــــــ کمائی کا نقصان ــــــ اس کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی، باہمی عداوت، جھگڑے فساد، جو اکثر و بیشتر فوجداری پر منتج ہوتے ہیں۔

خدا کی یہ مخلوق اس تباہ کن مصیبت کا شکار کیوں ہے؟ اس کا کم از کم اسّی نوّے فیصد سبب ہماری فقہ کا قانونِ وراثت ہے جس نے ملکی قانون کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ یہ تمام جھگڑے، جھمیلے ورثہ کی تقسیم کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جن کے اپنے طور پر نپٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ہمارا قانونِ وراثت اس قدر پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے کہ عوام تو ایک طرف قانون دان حضرات میں بھی خال خال ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس پر عبور ہو۔ اس کا نتیجہ بیس بیس سال تک پھیلے ہوئے تقسیم جائداد کے مقدمات ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ترکہ کی تقسیم کے متعلق دو تین آیتوں میں ایسے جامع، سہل اور آسان قوانین دے دیئے ہیں کہ دنیا بھر کے مقننین ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ان قوانین کی رو سے میاں بیوی ــــــ ماں باپ ــــــ اولاد اور بعض حالات میں بھائی بہن، کو وارث قرار دیا گیا ہے اور ان کے حصّے بھی متعین کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق تقسیم وراثت کے سلسلے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی لیکن ہماری فقہ نے . . . .

. . . کہا کہ اس کی جگہ ہمارا وضع کردہ قانون نافذ ہوگا۔ ان کے قانون کی رو سے بیسیوں قسم کے وارث قرار دے دیئے گئے اور ان کے حصّے بھی عجیب و غریب انداز سے مقرر کئے گئے ــــــ ذوی الفروض ــــــ ذوی الارحام ــــــ عصبات۔ پھر عصبات میں عصبہ بالذات، عصبہ بالغیر، عصبہ مع الغیر۔ اور پھر ان دیگر دور و نزدیک کے متعدد وارث۔ جہاں تک ان

کے حصّوں کا تعلق ہے ہم ان کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں آپ اسے بمشکل یاد کر یں گے۔ یعنی جب ان حصّوں کو جمع کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر ان کی حاصل جمع (۱) نہیں آتی ——— کبھی کم رہ جاتی ہے کبھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے عول کا قاعدہ وضع کیا گیا۔ یعنی حصّوں میں کمی بیشی کر کے حاصل جمع کسی نہ کسی طرح (۱) کر لی جائے۔ فقہ میں وراثت سے متعلق قوانین کو الفرائض کہہ کر پکارا جاتا ہے اور یہ ایسا مشکل فن ہے کہ فارغ التحصیل علماء میں سے بھی شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوتا ہے جسے ان پر عبور حاصل ہو۔ اس کا خمیازہ وارثوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآنی قانونِ وراثت کی رو سے ترکہ کی تقسیم میں کوئی قانونی دقت پیش نہیں آتی۔ لیکن قرآن کریم قانون سے آگے جا کر انسان کے انفرادی تقاضوں کی بھی رعایت رکھتا ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اب وہ ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس شخص کے ہاں ایک اور بیٹا حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ قرآنی قوانینِ وراثت کی رو سے اس شخص کے ترکہ میں سے ان دونوں بھائیوں کو یکساں حصّہ ملے گا۔ لیکن حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اس نومولود کی پرورش، تربیت، تعلیم وغیرہ کے اخراجات کے پیشِ نظر اسے زیادہ سے زیادہ حصّہ ملے۔ قرآن کریم نے اس قسم کے انفرادی حالات کے تقاضوں کا حل خود ہی تجویز کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہر شخص اپنی دولت اور جائداد کا آپ مالک ہے اور اس باب میں اسے کامل اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی بطورِ اپنے حق کے (AS OF RIGHT) اس کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد کچھ مطالبہ نہیں کر سکتا۔ وہ جس طرح جی چاہے اپنی دولت اور جائداد کو تقسیم کر دے۔ اگر وہ اپنے مرنے کے بعد اس قسم کی تقسیم کرنا چاہتا ہے تو وہ وصیّت کے ذریعے ایسا کر سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے ان تمام مشکلات کا حل جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے وصیّت کی رو سے کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک وصیّت کی اس قدر اہمیّت ہے کہ اس نے ہر مسلمان پر وصیت کرنا فرض قرار دے دیا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں ہے :-

> كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲/۱۸۰)۔
>
> تم میں سے جب کوئی مرنے کے قریب ہو اور وہ کچھ مال اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو تو اس پر خدا کی طرف سے فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر اقرباء (میں سے جس کے لئے چاہے) قاعدے کے مطابق وصیّت کرے۔ یاد رکھو ایسا کرنا متقین پر لازم ہے۔

آپ اس حکم کی اہمیت پر غور کیجئے کہ شروع میں کہا گیا ہے۔ "كُتِبَ عَلَيْكُمْ" "تم پر یہ فرض قرار دیا جاتا ہے" اور آخر میں کہا گیا ہے حقاً علی المتقین "ایسا کرنا متقین پر لازم ہے"۔ یعنی یہ نہیں کہ انسان چاہے تو وصیّت کرے اور چاہے نہ کرے۔ وصیّت کرنا فریضۂ خداوندی ہے جس کی بجا آوری ہر مسلمان پر لازمی ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس حکم میں یہ نہیں کہا گیا کہ تم اتنے حصّے سے متعلق وصیت کر سکتے ہو اس سے زیادہ نہیں۔ یا فلاں کے حق میں وصیّت کر سکتے ہو اور فلاں کے حق میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس اختیار پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی مصلحتوں کو آپ بہتر سمجھتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں جو "بالمعروف" کہا گیا ہے۔ یعنی معروف طریق کے مطابق۔ تو اس معروف طریقہ کی وضاحت بھی قرآن کریم نے خود ہی کر دی ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ کی آیات (۱۰۸ - ۱۰۶) میں اس معروف طریق کی بڑی وضاحت کر دی کہ وصیت کس طرح لکھی لکھائی جائے گی، گواہ کس قسم کے ہوں گے، گواہی کیسے درج ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ سورۃ البقرۃ کی آیت (۱۸۱) میں بڑی تہدی سے کہہ دیا کہ کوئی شخص اس وصیت میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس سے اگلی آیت (۱۸۲) میں البتہ اتنی گنجائش رکھ دی کہ اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے حق و انصاف سے کام نہیں لیا تو اگر وہ ان میں مصالحت کی کوشش کرے تو اس میں کچھ حرج کی بات نہیں۔ اگر کچھ مصالحت ہو جاتی ہے تو فبہا۔ ورنہ فیصلہ بہرحال وصیت کرنے والے کا ہوگا کیونکہ خدا نے اس کے اختیار پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وصیت کے متعلق قرآن مجید کے احکام۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب ہر شخص کو اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کی رو سے کلی اختیارات حاصل ہیں تو پھر قرآن میں دیئے گئے قوانینِ وراثت کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے قوانینِ وراثت میں دے دیا۔ اس نے کہا کہ اگر اس شخص کی وصیت اس کی پوری جائداد کو محیط نہ ہو تو جتنا کچھ اس وصیت کے بعد باقی بچے، اتنے حصے کو قرآنی قوانینِ وراثت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ قوانینِ وراثت سے متعلق ہر حصے کے بعد کہا گیا ہے: مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ (۴/۱۱ و ۴/۱۲) یعنی یہ تقسیم متوفی کا قرضہ ادا کر دینے اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد عمل میں آئے گی۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے تقسیمِ وراثت کو کس قدر آسان اور ہر شخص کے انفرادی حالات کے مطابق بنا دیا۔ اس کی رو سے اس باب میں نہ کوئی جھگڑا پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی لوگوں کو سالہا سال تک کچہریوں کے احاطے میں خوار اور پریشان ہونا پڑتا۔

لیکن ہماری فقہ نے جہاں چاہے ..... یہ کہا کہ قانونِ وراثت .... ہمارا چلے گا، اس کے بعد یہ بھی کہہ دیا کہ کسی کو وصیت کا حق بھی قرآن کے مقرر کردہ قانون کے مطابق حاصل نہیں۔ یہ ہمارے قانون کے مطابق حاصل ہوگا۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ ایک شخص اپنے ترکہ کے صرف ۱/۳ حصے تک وصیت کر سکتا ہے اور وہ بھی اپنے ورثاء میں سے کسی کے حق میں نہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں صدیوں سے یہی فقہی قوانین نافذ چلے آ رہے ہیں۔ اور کسی کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ احکامِ خداوندی کو منسوخ کر کے ان کی جگہ ..... غیر قرآنی قوانین کو اسلامی احکام کی حیثیت سے نافذ کرنے کی جرأت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ احکامِ خداوندی میں تبدیلی کے متعلق، اور تو اور، خود حضور نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرا دیا گیا کہ

مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۰/۱۵)

یہ میرے حیطۂ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس قرآن میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر سکوں (جب یہ کتاب میری تصنیف ہی نہیں تو مجھے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے) میری تو اپنی کیفیت یہ ہے کہ میں اس کتاب کا اتباع کرتا ہوں۔ اس کے سوا کسی اور چیز کا نہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو یہ معصیتِ خداوندی ہوگی اور معصیتِ خداوندی کی جو سزا ہے میں اس سے بہت ڈرتا ہوں۔

یعنی حضور نبی اکرمؐ تو قرآن کریم میں کسی قسم کے ردّ و بدل کو معصیتِ خداوندی اور مستوجب عذابِ الٰہی قرار دیتے ہیں اور

ہماری فقہ ہے کہ قوانینِ خداوندی کے علی الرغم اپنے وضع کردہ قوانین کو اسلامی کہہ کر منواتی چلی آرہی ہے۔ اس کے جواز اور تائید میں ان کی طرف سے ایک ہی دلیل دی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ اسلاف کا مسلک ہے جس میں کسی قسم کا ردّوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اس اسلاف پرستی سے امت کس قسم کے ضیق میں مبتلا ہے اس کا اندازہ ان بیشمار خطوط سے لگ سکتا ہے جو صرف قانونِ وصیت کی پیدا کردہ مشکلات اور پریشانیوں کے نواگر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

میں نے عمر بھر کی حلال کمائی سے مختصر سی جائداد پیدا کی ہے جو میری اور میری بیوہ لڑکی اور اس کے معصوم بچوں کے بسر اوقات کا ذریعہ ہے۔ میرے قریبی رشتہ دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے میرے خلاف دشمنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور وہ اب بھی میری موت کے منتظر ہیں۔ میرے مرنے کے بعد میری اس بے سہارا لڑکی اور اس کے بچوں کا کیا حشر ہوگا اس کے تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی وصیت میں یہ مختصر سا ذریعہ آمدنی اور رہائش اس کے نام کر جاؤں لیکن مجھے بتایا جاتا ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ شریعت کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا میرے ترکہ میں سے تھوڑا سا حصہ میری لڑکی کو مل سکے گا اور باقی سب وہ لوگ لے جائیں گے جو عمر بھر میری جان تک کے لاگو رہے ہیں۔ اور چونکہ مکان کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے اس لئے جو تھوڑا سا حصہ میری لڑکی کو ملے گا اس پر بھی عملاً یہی لوگ قابض رہیں گے۔ وہ بیچاری ان کا مقابلہ کیا کر سکے گی؟ اس پریشانی نے میری زندگی دشوار کر رکھی ہے!

اس کے بعد انہوں نے پوچھا ہے کہ

کیا یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اپنی بیٹی کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا! اگر نہیں تو پھر اسے قانونِ شریعت کس طرح کہا جاتا ہے؟

یہ تو محض ایک مثال ہے۔ مروجہ قانونِ وصیت نے کس کس قسم کی پریشانیاں پیدا کر رکھی ہیں؟ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ حال ہی میں اس معصیتِ خداوندی سے چھٹکارے کی ذرا سی جھلک سامنے آرہی تھی لیکن وا حسرتا کہ وہ اُمید بھی بر نہ آئی۔ حکومت پاکستان نے شریعت بنچوں کے قیام کا انتظام کیا اور کہا کہ ان میں قرآن و سنت کے خلاف ہر قانون کو چیلنج کیا جا سکے گا۔ اور ان بنچوں کو اس کا اختیار ہوگا کہ جس قانون کو قرآن اور سنت کے خلاف پائیں اسے کالعدم قرار دے دیں۔ فقہی قوانینِ وراثت اور قانونِ وصیت ایسے تھے جنہیں کسی شریعت بنچ کے سامنے لایا جاتا تو وہ انہیں پہلی نشست ہی میں کالعدم قرار دے دیتی، کیونکہ ان کے خلافِ قرآن ہونے کے لئے کسی خارجی ثبوت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن متعلقہ آرڈی ننس میں یہ کہہ دیا گیا کہ شخصی قوانین (پرسنل لاز) شریعت بنچوں کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں۔ فقہی قوانینِ وراثت اور وصیت کا شمار شخصی قوانین میں ہوتا ہے اس لئے انہیں شریعت بنچوں میں چیلنج ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا، یہ اُمت ..... اب بھی ان قوانین سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرما

یہ اس قوم کی حالت ہے جس نے اور تو اور، حالیہ رمضان شریف میں اس ارشادِ خداوندی کو لاکھوں مرتبہ دہرایا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے

باسمہٖ تعالیٰ

غلط معاشرہ کی تاریکیوں میں شعاعِ اُمید

اپنے انداز کی ایک منفرد درسگاہ

(قرآنک کالج)

(شیخ) سراج الحق
پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنک کالج و قرآنک ریسرچ سنٹر

قوموں کا مستقبل اُن کی اُبھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس قسم کے آج کے نوجوان، اسی قسم کی کل کی قوم۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اس آئیڈیالوجی کے مطابق کرتے جس کے تحفّظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔ یہ قوم کونسی ہے جس کی ہم اس قدر شکایت کرتے ہیں؟ یہ انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو تشکیلِ پاکستان کے وقت ہماری درسگاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہی طالب علم اب ہماری قوم کا ہوش مند طبقہ بن گئے اور انہی کا رونا ہم آئے دن روتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ ہم قوم کی بے راہ روی کا رونا بھی روتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر سال اسی قوم میں اضافہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو نوجوان ہماری درسگاہوں سے غلط تعلیم حاصل کر کے باہر نکلتے ہیں، وہ ہماری قوم کے اجزا بنتے ہیں۔ اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔

(۲) پاکستان کی آئیڈیالوجی، قرآن کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی تصوّر کے سوا کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب اور دارالعلوم الگ کھولے جائیں اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ۔ دین اور دنیا کی یہ ثنویت جسم اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا طریق ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا جائے

یا ایم اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر لیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات۔ تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ——— غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے۔ یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ

> فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے۔

اسے بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں پختگی اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اِس وقت اس قدر رونا رو رہے ہیں۔

(۳) طلوعِ اسلام اس امر کی مسلسل کوشش کرتا رہا کہ پاکستان کے نظامِ تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی ہو جائے جس سے مذکورہ صدر مقاصد حاصل ہو سکیں ——— آپ اس کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اس نے کس اصرار و تکرار سے ارباب نظم و نسق کی توجہ اس طرف منعطف کرائی لیکن (بدقسمتی کہئے) اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ نظامِ تعلیم دن بدن بگڑتا چلا گیا اور قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی پریشاں نظری اور بے راہ روی ہر دیدہ بینا کے لئے عبرت کا الم انگیز مرقع بنتی گئی۔ جب اُدھر سے قطعاً مایوسی ہو گئی تو کچھ عرصہ پہلے، مفکرِ قرآن، محترم پرویز صاحب نے، کہ جن کی عمر انہی مقاصد کے حصول کی تگ و تاز میں گذری ہے، یہ تجویز پیش کی کہ دوسروں کی طرف نگاہ امید لگائے رکھنے کے بجائے، اس باب میں کیوں نہ خود ہی کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ ایک اپنا کالج کھولا جائے جس میں عام تعلیم، یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدہ کے مطابق ہو، تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل طالب علم، زندگی کے کسی شعبے میں، دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے اور اس کے لئے مختلف میدان، دوسرے طالب علموں کی طرح کھلے ہوں۔ لیکن اس کالج میں یہ مضامین اس طرح پڑھائے جائیں کہ طلباء کو ساتھ کے ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ ان میں کونسی بات قرآنی تعلیم کے خلاف ہے، اور قرآنِ کریم اس باب میں کیا نقطۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، انہیں قرآنِ کریم کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ

(i) پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں، وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ افراد کی زندگی، اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ، قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کونسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے، یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے۔ اور

(ii) دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی۔ معاشرتی، سیاسی۔ قومی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے، قرآنِ کریم ان مسائل کا کیا حل تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں، قرآنی نقطۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور خود اپنے ملک میں بھی دوسروں کی فکری راہ نمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسروں کے لئے قابلِ تقلید مثال بن سکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت پیش کر سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائیں اور وہ سیرتِ نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ رکھ لیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تربیت کے لئے کالج کے ساتھ ہوسٹل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے ایک جدید طرز کی درسگاہ کے قیام کا پروگرام سامنے رکھا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ اس کی ابتداء ایف۔ اے (سالِ اوّل) سے کی جائے اور اسے سال بہ سال آگے بڑھاتے چلے جائیں۔ اس کے بعد، ابتدائی اسکولوں کی بنیاد رکھی جائے تاکہ شروع ہی سے بچوں کی تعلیم اسی نہج پر ہو۔ درسگاہیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے قائم کی جائیں اور جب یہ سلسلہ پھیل جائے تو اس کے لئے ایک الگ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انہی درسگاہوں میں اساتذہ تیار کئے جائیں۔ اس طرح یہ درسگاہیں ملک کے عام نظامِ تعلیم کے لئے نمونہ کا کام دے سکیں گی اور وہ نظام خود بخود اپنے آپ کو اس قالب میں ڈھال لے گا۔ اس سے پاکستان میں ایک نئی قوم تیار ہو جائے گی جو اس آئیڈیالوجی کی پیکر ہو گی، جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

پرویز صاحب کی ساری عمر قرآنِ کریم سے متعلق ریسرچ میں گذری ہے۔ اس ریسرچ کے نتائج ادارۂ طلوعِ اسلام کی وساطت سے عام کئے جاتے ہیں۔ ان کی تجویز تھی کہ مجوزہ کالج کے ساتھ "قرآنک ریسرچ سینٹر" بھی قائم کیا جائے۔

(۳) اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی متشکل کی گئی جسے حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔ اس کی ایک ایگزیکٹو کمیٹی بھی متشکل کر لی گئی۔ سوسائٹی کے چیئرمین

محترم پرویز صاحب ہیں۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصّہ میں قوم کے بچوں کو ایک گوشہ میں لے کر بیٹھ جائیں اور قرآنی شمع ان کے ہاتھ میں دے کر دنیا سے رخصت ہوں۔ ان کی اس آرزو کی بر و مندی بھی اسی اسکیم سے وابستہ ہے۔ اس لئے وہی اس کے سربراہ بھی ہوں گے۔

واضح رہے کہ اس کالج یا ریسرچ سینٹر کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہوگا، نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ یہ خالص قرآنی تعلیم و پیام کے مراکز ہوں گے جن میں کوئی بات دینِ خداوندی کے خلاف نہیں ہوگی۔

(۵) ان مقاصد کے لئے سب سے پہلا مرحلہ، زمین حاصل کرنا تھا۔ زمین خریدنے کے لئے جس قدر ابتدائی سرمایہ کی ضرورت تھی، اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ اراضی کہیں سے بطور عطیہ مل جائے لیکن اس میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر بعض مخلص احباب کی طرف سے ایک ایسی اسکیم سامنے لائی گئی جس سے (بحمداللہ) یہ مرحلہ بآسانی طے ہوگیا۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔

لاہور میں فیروز پور روڈ کے نہر کے پُل سے، نہر کے ساتھ ساتھ، دو پختہ سڑکیں، جانبِ جنوب گئی ہیں۔ دائیں جانب یونیورسٹی کا نیو کیمپس ہے اور بائیں طرف یونیورسٹی کے ہوسٹل۔ ہوسٹل کی ان عمارات سے آگے بڑھ کر، لہلہاتے کھیت اور سرسبز و شاداب درخت قطار در قطار کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی پُرفضا ماحول میں یہ اراضی واقعہ ہے جس پر کالج کی عمارات تعمیر کرنے کی تجویز تھی۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے کیا گیا کہ درسگاہ اور قرآنی تحقیقاتی مرکز سے ملحق متفق الخیال احباب کی ایک مختصر سی کالونی بھی بسائی جائے۔ اس مقصد کے لئے "احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی" قائم کی گئی۔ حصولِ اراضی کا کام اسی سوسائٹی کے ذمہ تھا۔ پہلے مالکانِ اراضی سے براہِ راست زمین خریدنے کے لئے قدم اٹھایا گیا لیکن ایک تلخ تجربہ کے بعد طے کیا گیا کہ گورنمنٹ سے کہا جائے کہ وہ ہمیں زمین (ACQUIRE) کر دے۔ اس مقصد کے لئے قریب چار لاکھ روپیہ حکومت کے خزانے میں جمع کرا دیا گیا۔

(۶) یہ اقدامات جاری تھے کہ اس زمانے کی حکومت نے تمام کالجوں کو نیشنلائز کر لیا اور جدید درسگاہیں کھولنے پر پابندی لگا دی۔ ہم نے کوشش کی کہ ہمیں مجوزہ کالج کے لئے اجازت مل جائے لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔ اس پر طے یہ کیا گیا کہ سردست قرآنک ریسرچ سینٹر قائم کر لیا جائے اور جب جدید کالجوں کے قیام پر پابندی اٹھ جائے تو اس کے ساتھ کالج بھی قائم کر لیا جائے۔

(۷) قریب پانچ سال تک حصولِ اراضی کی اسکیم مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جب اپنی آخری منزل میں پہنچی تو اُس زمانے کے گورنر اور بعد میں چیف منسٹر حکومت پنجاب صادق حسین قریشی صاحب نے مجوزہ اراضی کا کچھ حصّہ اپنے اور اپنے اہل خاندان کے نام کرا لیا اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے (ACQUISITION) کی اسکیم ہی کو کالعدم قرار دلا دیا۔ اس کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ قریب دو سال کے بعد فیصلہ ہمارے حق میں ہوگیا لیکن قریشی صاحب نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی جو آخر الامر خارج ہوگئی۔ اس طرح آخری فیصلہ تو ہمارے حق میں ہوگیا لیکن اس تگ و دو میں قریب آٹھ سال کا وقت ضائع ہوگیا جو ہمارے ہی نہیں ملّی نقطۂ نگاہ سے بھی نہایت قیمتی تھا۔

خدا خدا کر کے یہ مراحل طے ہو گئے اور حکومت کی طرف سے اس اراضی کا قبضہ ہمیں مل گیا۔ اب ہم حد کے ضمن سے اس قابل ہیں کہ عمارات کی تعمیر کے لئے عملی قدم اٹھایا جائے۔ جہاں تک پرائیویٹ کالجوں پر پابندی کا تعلق ہے حکومتِ پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ اب ان کے لئے اجازت دے دی جایا کرے گی۔ اپنے مجوزہ کالج کی اجازت کے لئے سلسلہ جنبانی کی جا رہی ہے۔ چونکہ اس اسکیم کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ ہی کسی سیاسی جماعت سے، اس لئے ہمیں امید ہے کہ اس کے لئے حکومت کی طرف سے اجازت ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ اس اثنا میں قرآنک ریسرچ سنٹر کے قیام کے ابتدائی مراحل کا آغاز بلا تاخیر کیا جا رہا ہے۔

(۸) جب ہم نے ۱۹۶۹ء میں اس اسکیم کا اعلان کیا تھا تو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے احباب نے جس والہانہ انداز سے اس پر لبیک کہا تھا وہ بڑا امید افزا تھا۔ نقد عطیات کے علاوہ اکثر احباب نے اپنی طرف سے کچھ تعمیر کرنے کے بھی وعدے کئے تھے۔ ان میں سے اکثر عطیات موصول ہونے بھی شروع ہو گئے تھے لیکن حصولِ اراضی کے سلسلے میں جو رکاوٹیں سامنے آ رہی تھیں ان کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا کہ جب تک اس باب میں حتمی فیصلہ نہ ہو جائے، عطیات کا سلسلہ ملتوی کر دیا جائے۔ اب جبکہ یہ تمام رکاوٹیں دُور ہو گئی ہیں ہم احباب سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے عطیات کے لئے فیاضانہ طور پر آگے بڑھیں۔

حبیب بنک ——— مین مارکیٹ برانچ ——— گلبرگ لاہور

میں "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ" کا حساب کھلا ہوا ہے۔ تمام چیک اور بنک ڈرافٹ سوسائٹی کے نام سے کاٹے جائیں اور:۔

مرزا محمد خلیل صاحب۔ خزانچی، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور

کے نام بھیجے جائیں۔ ان کی طرف سے موصول شدہ عطیات کی باقاعدہ مطبوعہ رسیدیں بھیجی جائیں گی اور ان کا اعلان ماہنامہ طلوعِ اسلام میں بھی کیا جاتا رہے گا تاکہ حساب چیک کرنے میں آسانی رہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس دس سال کے عرصے میں تعمیری اخراجات میں جس قدر اضافہ ہو گیا ہے: اس کے پیشِ نظر اب بہت زیادہ فنڈ کی ضرورت ہو گی۔ احباب اسی نسبت سے اپنے عطیات سے نوازیں۔

(۹) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے لئے عطیات کو حکومت نے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے رکھا ہے۔ اس کا حوالہ حسبِ ذیل ہے:

(S.R.O. NR 654(K)-65, OF 4-8-1965 (GAZETTE OF PAKISTAN, PART I DATED 19-8-65)

(۰)

آخر میں اسے پھر دہرا دیا جائے کہ جب یہ تعلیمی اسکیم عمل میں آ گئی ——— اور جب آپ ہمت کریں گے تو عمل میں کیوں نہیں آئے گی ——— تو اس سے قوم ایک نیا موڑ مڑ جائیگی۔ اس سے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل جائے گا اور اس میں حصہ لینے والے ——— السّابقون الاوّلون کا نام تاریخ کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا جس طرح سرسید کا دارالعلوم حصولِ پاکستان پر منتج ہوا، چہ عجب کہ یہ ریسرچ سینٹر اور درسگاہ پاکستان کو قرآنی مملکت میں تبدیل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ کتنی حسین ہے ہماری یہ آرزو اور کیسا درخشندہ ہے اس کا مستقبل ——— واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔ والسلام

نیازآگیں (شیخ) سراج الحق

(اکتوبر ۱۹۷۹ء) سیکرٹری۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور

(۰)

میری زندگی کی آخری آرزو

— پرویز —

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

میری ساری عمر، قرآنی فکر و پیغام کی نشر و اشاعت میں گزری ہے۔ اس طول طویل سفر کی داستان تو دراز ہے، لیکن ملخص اس کا یہ ہے کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

آج میری اس فقیرانہ صدا کے اوّلین مخاطب یہی ہمرہانِ قافلہ، فقرآنی ہیں۔

رفیقانِ محترم! آپ نے اس جادۂ منزلِ وفا میں جس کشادہ نگہی اور فراخ دلی سے میرا ساتھ دیا ہے، میری زندگی کا ایک ایک سانس اس کے لئے سراپا تشکر و سپاس ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ میں نے جب بھی آپ احباب سے کچھ مانگا، آپ نے نہایت خندہ جبینی سے مجھے نوازا، بلکہ کیفیت یہ رہی کہ ؎

میں ہمیشہ اپنے سوالِ شوق کی کمتری پہ خجل رہا — کہ نوازشِ بے کراں نے مجھ کو مری طلب سے سوا دیا

آج میں (شاید) زندگی میں آخری بار فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے لئے سرِ بازار مصر آ رہا ہوں — "آخری بار" اس لئے کہ یہ میری زندگی کی آخری آرزو اور میرے مشن کا منتہا ہے، جس کے لئے میں آپ احباب کے سامنے جھولی پھیلانے کی جرأت کر رہا ہوں۔

میں نے ایک قرآنی مملکت کے قیام کے لئے خطۂ زمین حاصل کرنے کی غرض سے تحریکِ پاکستان میں جو خدمات انجام دیں، اُن سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، اربابِ اقتدار کی خدمت میں پہلی گذارش یہ تھی کہ ہم جو اُدھر سے آئے ہیں یا جو پہلے سے یہاں موجود تھے، ان کے ذمے یہی فریضہ عائد کیجئے کہ وہ اس سرزمین کی سرحدوں کو مستحکم رکھیں۔ لیکن آپ ہماری نژادِ نو کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں کہ یہ صحیح معنوں میں امتِ مسلمہ بن کر اُس مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکے جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے۔ ان اربابِ اقتدار میں (جن کے ہاتھ مختلف اوقات میں زمامِ حکومت رہی) اکثر ایسے تھے جن سے میری راہ و رسم تھی، اور باقی ایسے جن سے شناسائی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ایک کی خدمت میں حاضر ہو کر گذارش کیا کہ ملک کے نظامِ تعلیم کو قرآنی قالب میں ڈھالیئے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو آگے چل کر ایک ایسی ناقۂ بے زمام کی سی قوم وجود میں آجائے گی جو کسی کے سنبھالے سنبھل نہیں سکے گی۔ میری اس صدائے دردمند سے اتفاق تو ہر ایک نے کیا، لیکن عملی قدم کسی نے بھی نہ اٹھایا۔ اس کے متعلق میں انتہائی جگر سوزی کے ساتھ اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ ؎

کسی کو ننگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

برسہا برس کی اِس لاحاصل نوا گری سے ہار تھک کر میں نے بالآخر فیصلہ کیا کہ ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش ! براہِ دیگراں رفتن عذاب است

اور اس طرح ۱۹۶۵ء میں مَیں نے اپنے انداز کی ایک منفرد درس گاہ کے قیام کی اسکیم پیشِ خدمتِ احباب کر دی - ہر چند یہ اسکیم، اقبالؒ کے الفاظ میں ایک "ذرّۂ ناچیز کے آسمانِ نو ساختن" کے مترادف تھی، لیکن میری ساری عمر اسی قسم کے ہمت طلب مراحل سے گذری ہے، اس لئے مَیں نے بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا کہ کر اس سفینۂ برگِ گل کو موجوں کے تلاطم کے حوالے کر دیا۔ اِس کے بعد اس کشتی پر کیا گزری، یہ صبر آزما داستان سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکی ہے۔ جاں گُسل انتظار کے اِس لامتناہی عرصہ میں اپنے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ

کسے خبر کہ نگارِ سحر کی حسرت میں تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گذری

جوں جوں عمر گھٹتی جاتی تھی ناامیدیوں کے سائے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ اس شدتِ انتظار میں یہی غم میرے لئے وجۂ جانکاہی نہیں تھا کہ میرا عرصۂ حیات بڑی تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ جب قوم کے وہ نونہال جو اس درسگاہ میں داخلہ کا شوق بے پایاں دل میں رکھتے تھے، مجھ سے پوچھتے کہ بابا جان! کیا ہمارا کالج اس سال بھی نہیں کھلے گا ؟ تو انہیں مایوس ہوتے دیکھ کر میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا۔ اُف! قوم کے کتنے قیمتی بچے اس غلط معاشرہ کے مجرمانہ تغافل اور عیارانہ چابکدستی کی نذر ہو گئے۔ نہ معلوم، وہ اس وقت گمرہی کی کن ہولناک وادیوں میں بھٹک رہے ہوں گے۔ اس کی ساری ذمہ داری ہماری قوم کے سر پر عائد ہوتی ہے، اور قوم اس کا خمیازہ بھی بھگت رہی ہے۔ بہر حال جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ سفینہ ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے بعد بالآخر کنارے سے بر آہی لگا ہے۔

بعید از سپاس گزاری ہوگا اگر مَیں، بیتابیٔ تمنا اور صبر طلبیٔ عشق کی اس کرب انگیز داستان میں اُن مخلص احباب کی کوہ کنی اور خارہ شگافی کا ذکر نہ کروں جو اپنے جہدِ مسلسل سے بالآخر جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ میری عمر اگرچہ (۷۶) سال سے اُوپر ہو رہی ہے، لیکن اِس شعاعِ اُمید نے میرے سینے میں تازہ ولولوں کو بیدار کر دیا ہے اور مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اگر مبدا فیض کی کرم گستری نے مجھے کچھ بھی "توسیع" (EXTENSION) عطا کر دی اور طالب علموں کے دو چار گروپ بھی میرے زیرِ تربیت پرورش پا گئے تو قرآنی فکر کا یہ ننھا سا دیا جسے آپ احباب کے خونِ جگر نے اِس وقت تک روشن رکھا ہے، نہ صرف یہ کہ میرے بعد بھی جلتا رہے گا، بلکہ اِس کی تابندگی عالمتاب ہوتی چلی جائے گی۔ آپ احباب جتنی تیزی سے اس اسکیم کو تکمیل تک پہنچا دیں گے اتنی ہی میری عمر بڑھ جائے گی۔ اس کے لئے مالی تعاون کا طریق رفیقِ محترم شیخ سراج الحق صاحب نے پیشِ خدمتِ احباب کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمتوں میں برکت اور میرے عزائم کو برومندی عطا فرمائے۔ والسلام

زیر بارِ منتِ احباب

[illegible]

صدر۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲

لاہور